www.allurdu.com

...ں باب

...ی جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ معظم علی اور عبداللہ خان اپنے
...ں میں داخل ہوتے۔ عبداللہ خاں کا گھر پہلے آتا تھا۔ معظم علی نے اس
...روازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا: "عبداللہ اب تم اپنے گھر جاکر
...ا بھی لے جاؤ۔"
...ن نے معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ اپنے مکان کی طرف

...سنسان گلی میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد معظم علی نے اپنے مکان کا
...ن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے صابر کو پکارنے کی کوشش کی
...ے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔
...وار زیادہ اونچی نہ تھی۔ وہ چند ثانیے توقف کے بعد دیوار پر چڑھا اور صحن میں کود
...کا صحن تاریک تھا اور گلی کی طرح یہاں بھی ایک بالشت پانی جمع ہو چکا
...نے کی دیوار کے ایک کھلے دروازے سے گزرنے کے بعد رہائشی مکان کے
...را۔ اسے نچلی منزل میں کونے کا ایک کمرہ روشن نظر آیا۔ کمرے کا دروازہ
...تھیں۔ روشن کمرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی ٹانگیں [illegible]
...ا جہاں ہر وقت مسرت کے قہقہے اس کا استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی چمکی

اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ اداس اور سنسان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے سے گزرنے کے بعد کونے کے کمرے میں داخل ہوا۔ چند ثانیے وہ بے حس و حرکت کمرے کے درمیان کھڑا رہا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا رنگ بے حد زرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ عورت جس کی صحت پر پڑوس کی نوجوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں، اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

"معظم! بیٹا تمہارا گھر لٹ چکا ہے۔" اس کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ آمنہ نے آنکھیں کھولیں۔ معظم علی "امی جان! امی جان!" کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا دیئے اور اس نے بستر کے قریب دوزانو ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ آمنہ معظم علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔ چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کہا: "میرے بیٹے! میرے لال تم اس طوفان میں آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے ابا جان کو بھی تمہارا انتظار تھا لیکن تم نہ آسکے اور یوسف ہم میں سے کسی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔"

معظم نے چند سسکیاں لیں اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔

[illegible] امی جان آپ کو بخار ہے۔ میں طبیب کو بلاتا ہوں... صابر کہاں ہے؟"

ماں نے کہا: "صابر ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ وہ کئی راتوں سے نہیں سویا اور طبیب کو بلانے

Ketabton.com

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی ضرورت نہیں۔ حکیم احمد خان ہر روز یہاں آتے ہیں۔ آج شام کے وقت بھی مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ معظم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ وہ پرسوں ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تھے۔ تمھارے ابّا اور یوسف کی بندوقیں اور تلواریں لے گئے ہیں۔ پڑوسی اب ہمارے گھر کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی نے میرا بہت خیال رکھا ہے، اگر وہ حمیدہ کو یہاں نہ بھیجتیں تو میں شاید اب تک تمھارا انتظار نہ کر سکتی۔ صابر کے سوا ہمارے سب نوکر خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ میری طرح حسین بیگ بھی بستر پر پڑا ہوا ہے لیکن فرحت صبح شام مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہتی ہے۔ بیٹا! ہماری طرح ان کا گھر بھی اجڑ چکا ہے۔"

"امی جان میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ عبداللہ خاں مجھے راستے میں ملا تھا۔"

ماں نے کہا۔ "یوسف اور افضل پلاسی کے میدان میں دفن ہیں۔ کاش میں موت سے پہلے وہاں جا سکتی۔ حسین بیگ وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اسے حکم ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔ میر جعفر نے اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی ہے۔ وہ یہاں سے ہجرت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ!"

"امی جان جب آپ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہریں گے۔"

ماں نے عمر رسیدہ عورت کی طرف دیکھا اور کہا: "حمیدہ تم نے بھی دو راتوں سے آرام نہیں کیا ہے۔ جاؤ ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ!"

حمیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن باہر جھانکنے کے بعد مڑ کر بولی: "بارش تھم چکی ہے۔ میں گھر جاتی ہوں۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیں!"

حمیدہ کمرے سے نکل گئی اور معظم کی ماں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا: "بیٹا اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے!"

معظم کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ماں کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "امی جان آپ

کا بخار بہت تیز ہے۔ میں حکیم کو بلاتا ہوں!"

"نہیں نہیں"! ماں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم میرے سامنے بیٹھے رہو!"

"تو میں صابر کو بھیجتا ہوں۔"

"حکیم دوا دے کر گیا ہے بیٹا! اب وہ اور کیا کرے گا۔ تم میری بات تو سن لو۔ اصطبل میں کھرلی کے دائیں سرے پر آخری کھونٹے کے بالکل ساتھ تمھاری امانت دفن ہے۔ وہ نکال لینا۔ وہ تمھارے کام آنے والی چیز ہے۔ میں آج صابر کو بتلانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔ جب وہ تلاشی لینے آئے تھے تو میں ڈرتی تھی لیکن تمھارے ابا جان کا خیال صحیح تھا۔ اگر میں اسے مکان کے اندر چھپانے کی کوشش کرتی تو وہ ضرور تلاش کر لیتے۔ انھوں نے ایک ایک کونے کی تلاشی لی تھی۔ شاید انھیں شک تھا کہ سراج الدولہ تمھارے ابا کو کوئی چیز دے گیا ہے۔ ظالم تمھاری کتابیں تک لے گئے ہیں۔ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن حکیم احمد خان نے کہا یہ مر رہی ہے اسے تنگ نہ کرو۔ میر جعفر کا بیٹا، میرن ان کے ساتھ تھا۔ وہ حسین بیگ کے گھر بھی گئے تھے۔ وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ فرحت کی ماں نے میرن کو بُرا بھلا کہا اور اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ فرحت آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔"

معظم علی غصے کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ کے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

ماں نے کہا۔ "بیٹا اب اس ملک میں عزت اور شرافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مرشد آباد پر خدا کا قہر نازل ہو چکا ہے۔ حسین بیگ کو علی وردی خاں کے وزیر سلام کرتے تھے، افضل اور آصف، سراج الدولہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آج میر جعفر جیسے ذلیل انسان کے ہاتھوں ان کی ماں اور بہن کی عزت محفوظ نہیں۔"

معظم علی کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کرب انگیز آواز نکلی۔ "امی جان میں اس سے

(c) ketabton.com: The Digital Library
www.allurdu.com

زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں اُن سے ان تمام مظالم کا بدلہ لوں گا۔"

"نہیں معظم تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ تمھارے باپ کو مرتے وقت یہی خوف تھا کہ تم جوش میں آ کر اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اور پھر دنیا میں ہمارا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میرے بعد یہاں سے کہیں دور چلے جانا اور وہ امانت ضرور نکال لینا، تمھارے کام آئے گی اور شاید تم اس سے حسین بیگ کی بھی مدد کر سکو۔ وہ ہیرے بہت قیمتی ہیں اور میں نے اپنے زیور اور چند اشرفیاں بھی ان کے ساتھ دفن کر دی ہیں لیکن کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیئے!!"

معظم علی نے پوچھا: "وہ ہیرے کہاں سے آئے؟"

"بیٹا تمھارے اباجان زخمی ہو کر سراج الدولہ کے ساتھ مرشدآباد پہنچے تھے۔ محل کے ایک پہریدار نے مجھے اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچی۔ ان کی حالت بہت خراب تھی — سراج الدولہ اور شاہی طبیب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ زخم بہت خطرناک ہیں اور اس حالت میں سفر کی وجہ سے ان کا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ سراج الدولہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہتا تھا کہ میں نے انھیں منع کیا تھا لیکن یہ کسی حالت میں بھی میرا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یوسف کی لاش کو بھی سپردِ خاک ہوتے نہ دیکھ سکے۔ میں شام تک وہیں رہی لیکن ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ رات کے وقت جب سراج الدولہ نے مرشدآباد چھوڑنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے پہریداروں کو حکم دیا کہ انھیں گھر پہنچا دیا جائے اور جب وہ ان کی چارپائی اٹھانے لگے تو سراج الدولہ کی ماں نے اپنا ہار اتار کر میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: "میری بہن یہ انعام نہیں خراج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے تمام خزانے بھی محمود علی خاں کی وفاداری کا صلہ نہیں ہو سکتے۔" لیکن میں نے اس کا تحفہ قبول نہ کیا۔ جب ہم محل سے نکلے تو خواجہ سرا ہمارے ساتھ تھا۔ سپاہی تمھارے اباجان کو گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن

خواجہ سرا رک گیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹی سی تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ نواب صاحب نے بھیجی ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ تھیلی میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

تمھارے اباجان راستے میں بیہوش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ہوش آیا تو انھوں نے اصرار کیا کہ میں وہ تھیلی جس میں بیش قیمت ہیرے تھے اپنے پاس رکھنے کی بجائے اصطبل میں دفن کر دوں گا۔ اس وقت میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے وہ تھیلی تمھاری کتابوں کی الماری میں رکھ دی۔ آدھی رات کے قریب وہ چل بسے۔ آخری وقت وہ مجھے بار بار یہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً ہجرت کر جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ تم یہاں رہ کر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ صبح کے وقت حکیم احمد خاں، مرزا حسین بیگ اور پڑوس کے چند غریب لوگوں کے سوا ان کے جنازے میں کوئی نہ تھا۔ حسین بیگ کی طبیعت بہت خراب تھی، حکیم احمد خان نے انھیں روکا لیکن وہ جنازے میں شامل ہونے پر بضد تھے۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے اور میں نے تمھارے لیے ان ہیروں کی حفاظت کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ رات کے وقت میں نے انھیں دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے زیورات بھی دفن ہیں۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ اگر تم نہ آئے تو میں صابر کو بتا دوں گی لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔ جب تم کھرلی کے بائیں سرے پر آخری کھونٹے کے ساتھ زمین کھودو گے تو تمھیں ایک صندوقچی ملے گی۔ صندوقچی کے اندر ایک چمڑے کی تھیلی ہے جس میں وہ ہیرے اور میرے زیورات ہیں۔"

معظم خاموش تھا۔ اسے جواہرات اور اشرفیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تصور میں کبھی اپنے بھائی کو میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرتا اور کبھی اپنے باپ کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ افضل کے متعلق سوچتا اور زندگی کی ہر شے اسے بے حقیقت اور بے معنی نظر آنے لگتی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ماں نے کہا۔"بیٹا تمھاری غیر حاضری میں فرحت تمھارے متعلق پوچھا کرتی تھی۔ وہ کتنی شوخ تھی لیکن اب اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ حسین بیگ کی بیماری کے باوجود ہر روز میرے پاس آتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اس نے حمیدہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ وہ مغرور ہیں لیکن انھوں نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ کاش تم اس احسان کا بدلہ دے سکو۔ بیٹا مجھے اپنے باپ کے پاس دفن کرنا!"

معظم نے کہا۔"نہیں امی جان آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ماں مسکرائی، لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں اور آہوں سے زیادہ کرب انگیز تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔"بیٹا یوسف جیسے بیٹے کی موت کے بعد کوئی ماں اور تمھارے ابا جیسے شوہر کی موت کے بعد کوئی بیوی زندہ نہیں رہ سکتی — بیٹا سچ کہو، تمھیں کوئی خطرہ تو نہیں؟ تم تو یہاں سے بہت دور تھے۔ میر جعفر کو تمھارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے!"

معظم علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔"امی جان مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

ماں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر معظم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔"بیٹا میں خدا سے دعا کرتی تھی کہ موت سے پہلے صرف ایک لمحہ کے لیے تمھیں دیکھ لوں۔ پھر میں خوشی سے جان دے دوں گی۔ لیکن اب تمھیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو جاتا ہے کہ تمھیں ان درندوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ بیٹا اگر تمھیں کوئی خطرہ ہے تو خدا کے لیے یہاں نہ ٹھہرو!"

معظم علی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"امی جان میری رگوں میں میرے غیور باپ کا خون ہے۔ اگر مرشد آباد بھیڑیوں سے بھر جائے تو بھی میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماں نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔"میرے اللہ میرے بیٹے کو دشمن سے بچانا۔ اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔" آہستہ آہستہ معظم کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔

"امی جان! امی جان!" معظم علی نے گھبرا کر کہا۔

ماں نے آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر معظم علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

"امی جان!" معظم علی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر اس نے ایک کپکپی کے بعد دو تین گہرے سانس لیے اور اس کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو تکیے پر گر پڑے۔

"امی! امی!" معظم علی اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکی تھی۔

معظم علی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ چلّانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ آمنہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک خواب ہے۔" "امی! امی!" وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی نبضیں ٹٹول رہا تھا۔ اسے گہری نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

○

پچھلے پہر چراغ ٹمٹما رہا تھا لیکن اس نے اٹھ کر تیل ڈالنے یا نوکر کو آواز دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کے دل میں کسی کو دیکھنے یا کسی کے ساتھ بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔ ماضی اور حال کے واقعات کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

وہ نیم خوابی کی حالت میں اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنے دستوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ مکتب کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا اور کبھی فوج کے جوانوں کے ساتھ فنون سپہ گری کی مشق کر رہا تھا۔ پھر جب وہ ماضی کے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حال کی تلخیوں کا سامنا کرتا تو اس کا دل نفرت اور حقارت سے بھر جاتا۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور وہ نیم خوابی کی حالت میں آنکھیں بند کیے کبھی دلکش اور کبھی بھیانک سپنے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے کانوں میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آنے لگی تاہم وہ بدستور آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ہاتھ کی انگلیاں اس کی پیشانی کو چھونے لگیں۔ پھر کسی نے نحیف اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "معظم! معظم!"

معظم نے مڑ کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کون! فرحت؟"

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا دیا۔

معظم علی نے کہا: "امی جان اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔"

فرحت نے اپنی اوڑھنی کے ساتھ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ میں انھیں دیکھ چکی ہوں۔ میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے۔ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور اسے اس ظلم، مکر اور ریا کی تاریک دنیا میں ایک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "فرحت میں بہت سخت جان ہوں۔"

فرحت نے کہا۔ "حمیدہ کہاں گئی؟ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو ہمیں اطلاع دینا۔ میں نے صابر سے بھی کہا تھا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "وہ رات کے وقت اپنے گھر چلی گئی تھی اسے امی جان نے بھیجا تھا۔"

"آپ کب آئے تھے؟"

"میں آدھی رات کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت امی جان کی حالت یاد تشویش ناک نہیں تھی۔ وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہیں لیکن پھر اچانک ــــ مجھے اب بھی ان کی موت کا یقین نہیں آتا لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ چند دنوں کے اندر اندر کتنی ناقابل یقین باتیں ہو چکی ہیں۔ یوسف اور افضل کی موت پر کیسے یقین آ سکتا ہے۔ فرحت کاش میں تمھیں بتا سکتا کہ افضل اور یوسف مجھے کتنے عزیز تھے اور ان کی موت کے میرے لیے کیا معنی ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمھارے ابا جان اب کیسے ہیں؟"

شام کے وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن آدھی رات کے قریب انھیں نیند آگئی تھی اور اب ان کی حالت کچھ بہتر ہے۔ نماز کے وقت مجھے امی جان نے کہا تھا کہ میں چچی جان کا پتہ کروں۔ اب میں جاتی ہوں۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

معظم علی نے کہا۔ "فرحت امی جان تمھاری بہت احسان مند تھیں اور میں بھی ہمیشہ تمھارا ممنون رہوں گا۔"

"لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا ملال رہے گا کہ میں آخری وقت ان کے پاس نہ تھی ــــ" یہ کہہ کر فرحت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن دہلیز سے باہر پاؤں رکھتے ہوئے وہ رکی اور مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ابا جان کہتے تھے کہ آپ کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ وہ ہر اچھے آدمی کو گرفتار کر

(c) ketabton.com: The Digital Library
www.allurdu.com

رہے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ اب میرے لیے کوئی بات خطرناک نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن آپ کو احتیاط ضرور کرنی چاہیئے!"

"مجھے یقین ہے کہ افضل کی بہن مجھے خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے گی۔"

"نہیں، میں آپ کو بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے سے منع نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان کے نرغے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔"

"اب سارا بنگال بھیڑیوں کے نرغے میں آچکا ہے۔"

فرحت کچھ اور کہے بغیر باہر نکل گئی۔

ایک ستارہ جسے اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر دیکھا تھا اس کے ظلمت کدہ میں نور کی کرنیں بکھیرنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔ معظم علی کچھ دیر دروازے میں کھڑا صحن کی طرف دیکھتا رہا۔ فرحت، مرزا حسین بیگ کی بیٹی، آصف اور افضل کی بہن اس کے گھر آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کر چکا تھا۔ لیکن سازِ حیات کے وہ تار جو کبھی اس کے تصور سے لرز اٹھتے تھے۔ اب خاموش تھے۔ آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں کا وہ صنم کدہ جسے اس نے فرحت کی خیالی تصویروں سے آباد کیا تھا ویران ہو چکا تھا۔

○

برآمدے کے دوسرے کونے میں صابر اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ معظم علی نے آگے بڑھ کر اسے جگایا۔ صابر بدحواسی کی حالت میں اٹھا اور بے اختیار معظم علی سے لپٹ گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی اس کی سسکیاں چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور پھر جب اس نے سنبھل کر اپنی تباہی کی داستان سنانے کی کوشش کی تو معظم علی نے کہا:

"صابر مجھے سب معلوم ہے۔"

صابر نے کہا۔ "آپ کی امی جان بیمار ہیں۔ چلیئے وہ اس کمرے میں ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔"

صابر چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا معظم علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں اور معظم علی دیوان خانے کے برآمدے میں محلے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حسین بیگ لاٹھی ٹیکتا ہوا مکان کے اندر داخل ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اور کمزوری کے باعث اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ افضل اور فرحت کے باپ کی یہ حالت معظم علی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر آگے بڑھا اور حسین بیگ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

معظم علی نے کہا۔ "چچا جان آپ کو بخار ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے تھا!"

حسین بیگ نے جواب دیا۔ "بیٹا! اب مجھے قبر میں ہی آرام مل سکتا ہے۔" حسین بیگ کچھ دیر برآمدے کے فرش پر معظم علی کے پاس بیٹھا رہا لیکن محلے کے لوگوں نے اسے مجبور کر کے کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد جب معظم علی کی والدہ کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا، حسین بیگ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن معظم علی نے کہا۔ "چچا جان! اس حالت میں آپ کو جنازے کے ساتھ نہیں جانا چاہیئے۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔"

محلے کے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حسین بیگ کو سہارا دیا اور وہ بادلِ نخواستہ اپنے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اپنی والدہ کو سپردِ خاک کرنے کے بعد معظم علی اپنے گھر جانے کی بجائے مرزا حسین بیگ کی حویلی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ نچلی منزل کے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے، فرحت اور اس کی والدہ ان کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے معظم علی

(c) ketabton.com: The Digital Library
www.allurdu.com

کی آمد کی اطلاع دی۔ فرحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا تو فرحت کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معظم علی، حسین بیگ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا "معظم علی! ہمیں ایک دوسرے کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تم نوجوان ہو اور تمھاری ہمت ہمارا آخری سہارا ہے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تمھارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے کئی دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں تمھارے گھر کھانا بھیج رہا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہیں بیٹھ کر کچھ کھالو۔"

"چچا جان مجھے بھوک نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر چند نوالے کھالو۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا "عابدہ! خادمہ سے کہو ان کے لیے کھانا لے آئے۔"

"میں خود لاتی ہوں۔" حسین بیگ کی بیوی یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے کھانا لا کر معظم علی کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ معظم علی نے حسین بیگ کے دوبارہ اصرار کرنے پر بادل ناخواستہ ایک لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا کہ اچانک ایک نوکر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا "میر میرن آیا ہے اور اس کے ساتھ مسلح سپاہی ہیں۔"

میر میرن، میر جعفر کا بیٹا تھا اور مرزا حسین بیگ اور معظم علی کے لیے اس کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مرزا حسین بیگ بستر سے اٹھا اور اپنی لاٹھی پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ معظم علی نے جلدی سے اٹھ کر ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ دیوانخانے کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ نیچے صحن میں میر میرن بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ دکھائی دیا۔ میر میرن اپنی عمر کے لحاظ سے کافی موٹا تھا۔ اس کے چہرے سے غرور، عیاری، بے حیائی اور سفاکی

مترشح تھی۔ وہ مرزا حسین بیگ اور معظم علی کو دیکھ کر آگے بڑھا اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر بولا۔ "تمھارا نام معظم علی ہے؟"

معظم علی کی خاموشی پر مرزا حسین بیگ نے جواب دیا۔ "ہاں ان کا نام معظم علی ہے۔"

میر میرن نے حقارت سے حسین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بوڑھے تم خاموش رہو!"

معظم علی نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر انگارہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

میر میرن نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "بدتمیز ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم مرشد آباد کیوں آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرشد آباد میرا گھر ہے۔"

میر میرن نے پوچھا۔ "کیا میدنا پور کے فوجدار نے تمھیں وہاں حاضر ہونے کا حکم نہیں بھیجا تھا؟"

"میدنا پور کے فوجدار نے مجھے وہاں بلایا تھا لیکن اس نے مجھے پلاسی کی جنگ کے حالات نہیں بتلائے تھے۔"

"اور اب تمھیں پلاسی کی جنگ کے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔"

"ہاں۔"

میر میرن نے کہا۔ "ہم تم سے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں۔"

"وفاداری کا حلف! میر جعفر کے لیے؟" معظم علی نے تن کر کہا۔

میر میرن نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم کسی اور کے لئے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "وفاداری کا حلف سنگینوں کے پہرے میں نہیں لیا جاتا۔ میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ میر جعفر بنگال کا حکمران ہے۔"

"سپاہیو!" میر میرن پوری قوت سے چلایا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے گرفتار کرلو!"

"ٹھہرو!" حسین بیگ نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دو تین قدم آگے بڑھ کر میر میرن سے مخاطب ہوا۔ "میر میرن خدا سے ڈرو۔ معظم علی کا باپ اور بھائی اپنے خون سے تمھارے باپ کی غداری کی قیمت ادا کرچکے ہیں۔"

میر میرن نے انتہائی غضب کی حالت میں آگے بڑھ کر حسین بیگ کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔

آن کی آن میں معظم علی نے یکے بعد دیگرے میر میرن کے منہ پر دو گھونسے رسید کیے میر میرن تیورا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔

سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں لیکن میر میرن چلایا۔ "خبردار! میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

چند سپاہی تلواریں پھینک کر معظم علی پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میر میرن کے حکم سے معظم علی کو صحن کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ میر میرن نے اس کی قمیص نوچ کر پھینک دی اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا لے کر کہا۔ "تمھارے جیسے باغیوں کی سزا موت نہیں۔ تمھاری سزا یہ ہے! کہو اب وفاداری کا حلف اٹھاتے ہو یا نہیں؟"

جب معظم علی پر کوڑے برسائے جا رہے تھے تو مرزا حسین بیگ نے اٹھ کر مداخلت کی کوشش کی۔ لیکن ایک سپاہی نے اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک فرحت کمرے سے نکلی اور بھاگ کر معظم علی اور میر میرن کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ میر میرن نے کوڑا بلند کیا تو وہ آگے بڑھ کر معظم علی کے لیے ڈھال بن گئی۔ میر میرن نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی تو اس

نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک سرا پکڑ لیا۔ دو سپاہیوں نے فرحت کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو کر چلا رہی تھی: "تم کمینے ہو، تم بزدل ہو! ایک آدمی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شیر بن گئے ہو۔"

میر میرن نے پے درپے معظم علی کو چند اور کوڑے لگائے اور جب اس نے بیہوش ہو کر گردن ڈھیلی چھوڑ دی تو اس نے سپاہیوں سے کہا: "اسے قیدخانے لے چلو۔"

پھر وہ آگے بڑھ کر حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم بوڑھے ہو اور اباجان نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم پر سختی نہ کی جائے لیکن اب ہمارے دشمنوں کے لیے بنگال میں کوئی جگہ نہیں میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم ایک ہفتہ کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جاؤ۔"

معظم علی کو ہوش آیا تو وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ دو مسلح سپاہی اس کے سر پر کھڑے تھے اور ایک تیسرا پانی کی بالٹی سے کپڑا بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر ڈال رہا تھا۔ معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ ایک سپاہی نے کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کے گھڑے سے پانی کا ایک پیالہ بھر کر اسے دیا۔ معظم علی نے پانی پینے کے بعد سپاہیوں کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "میں کہاں ہوں؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "تم مرشدآباد کے قیدخانے میں ہو۔"

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی جا چکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی کرب کی حالت میں منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لیے نئی نہ تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی قید رہ چکا تھا لیکن اس کا المناک پہلو یہ تھا کہ اسے اس سلطنت کا باغی قرار دیا جا چکا تھا جس کی آزادی کے لیے اس کا باپ، اس کا بھائی اور اس کے دوست شہید ہو چکے تھے۔ اٹھ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

دن بعد اس کی کوٹھڑی میں تین اور قیدی دھکیل دیئے گئے۔ یہ تینوں بنگال کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے اور ان کی زبانی معظم علی نے ان سے حسین بیگ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گرفتاری کے دوسرے روز مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے اور حکومت نے ان کی جائداد ضبط کرلی ہے۔ ایک افسر نے معظم علی کو بتایا کہ ان کے ساتھ تیس اور آدمی گرفتار ہوتے ہیں اور ابھی مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ گذشتہ چند دنوں میں مرشد آباد کا قیدخانہ بھر چکا ہے اور اب قیدیوں کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کی تجویز پر غور ہو رہا ہے۔ قید ہونے والوں میں صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متمول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقومات پیش نہیں کر سکے۔ میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشد آباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے اور اب لارڈ کلایو کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے اس نے بنگال کے امرا کو بے تحاشا لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔

○

معظم علی کو مرشد آباد کے قیدخانے میں اڑھائی مہینے گزر گئے۔ ایک دن قیدخانے کا داروغہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "معظم علی آج تمھارا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔"

معظم علی ننگی تلواروں کے پہرے میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا اور داروغہ کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قیدخانے کے ایک کشادہ کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے سامنے عدالت کی کرسی پر میر جعفر کے خاندان کا ایک فوجی افسر میر ناصر رونق افروز تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میر ناصر، اڑیسہ کی بعض لڑائیوں میں معظم علی کے ساتھ رہ

چکا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے میز سے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھنے کے بعد کہا۔ "معظم علی تمھارے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ تم میدنا پور کے فوجدار کا حکم ملنے پر وہاں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد آ گئے تھے۔ تمھارے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا اور تمھارے خلاف تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے گرفتاری کے وقت میرمیرن پر حملہ کیا تھا۔ یہ تینوں الزامات بے حد سنگین ہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے ان پہریداروں کی طرف دیکھا جو ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور پھر کرسیٔ عدالت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس عدالت میں آپ مجھ سے زیادہ بے بس ہیں۔ اس لیے میں صفائی پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ مجھے سرحدی قلعے سے میدنا پور روانہ ہوتے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے جس حکومت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ختم ہو چکی ہے اور اب میدنا پور کا فوجدار یا تو مرشد آباد کے حالات سے بے خبر ہے یا وہ ایک ایسی حکومت کا نمائندہ ہے جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد مرشد آباد میں ایسے لوگ مجھ سے وفاداری کا حلف لینا چاہتے تھے جن کے ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مجھ پر تیسرا الزام یہ ہے کہ میں نے میرمیرن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میرمیرن میرے نزدیک بنگال کے جائز حکمران کا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا بدزبان اور بداخلاق آدمی تھا جس نے میری قوم کے ایک ایسے بزرگ پر ہاتھ اٹھایا تھا جس کے نوجوان بیٹے بنگال کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں — میرا اصلی جرم یہ ہے کہ میں نے بنگال میں جنم لیا اور پھر ایک سپاہی کی حیثیت میں اس قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا، جس کے امرا اسے چند ٹکوں میں فروخت کرنے کے لیے تیار تھے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

میر ناصر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی سے بہت تنگ آچکے ہو۔ یہ جگہ ایسی تقریروں کے لیے موزوں نہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ بے بس ہے۔ میر جعفر کو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ میں آپ کی زبان سے اپنے متعلق ان کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔"

میر ناصر کچھ دیر گردن جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر چند سطور لکھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تمھارے جرائم نہایت سنگین ہیں لیکن تمھارے خاندان کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر تم کو سات سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

معظم علی نے ایک کرب انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میر ناصر کی طرف دیکھا اور میر ناصر نے اپنی گردن جھکا لی۔

معظم علی نے مڑ کر قید خانے کے داروغہ کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ داروغہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے منہ پھیرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔ "اسے لے چلو!"

رات کے وقت جب قید خانے کی کوٹھڑی میں معظم علی کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے وہ سر بسجود ہو کر انتہائی انکسار کے ساتھ یہ دعا مانگ رہا تھا۔ "میرے مولیٰ مجھے ہمت دے کہ میں اس آزمائش میں پورا اتر سکوں۔"

آٹھ مہینے اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں معظم علی کے ساتھی کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے اور ہر وقت وہ قید خانے سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

دسواں باب

ایک رات اچانک معظم علی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ باہر آئیں!"

معظم علی باہر نکلا تو چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ قید خانے کا داروغہ اور میر ناصر دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ میر ناصر نے کہا۔ "معظم علی میں تمھیں کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہوں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے تو تمھیں بیڑیاں پہننے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

معظم علی نے سوال کیا۔ "آپ کو میرے وعدے پر اعتبار آجائے گا؟"

"ہاں" میر ناصر نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"میں تمھارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

معظم علی نے داروغہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بے بس ہیں۔ لیکن اگر قید خانے سے باہر میرن میرا انتظار کر رہا ہے تو آپ کو کسی جھجک کے بغیر یہ بات کہہ دینی چاہیے۔"

داروغہ کی بجائے ناصر نے کہا۔ "میں آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نیک ارادے سے یہاں آیا ہوں۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

معظم علی نے کہا۔ "موجودہ حالات میں اگر اس ملک میں نیکی کا تصور باقی رہ گیا ہے تو یہ ایک معجزہ ہے۔ بہر حال میں اس مجبوری کی حالت میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چلیے!"

معظم علی، میر ناصر کے ساتھ قید خانے کے پھاٹک سے باہر نکلا تو دو سپاہی بندوقیں اٹھائے سامنے کھڑے تھے اس نے جواب طلب نگاہوں سے میر ناصر کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے وعدے پر اعتبار ہے لیکن اگر آپ غلطی کر بیٹھیں تو آپ کی جگہ میں عمر بھر کی قید کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ آدمی ہمارے پیچھے آئیں گے اور آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بہترین نشانہ باز ہیں۔"

معظم علی نے میر ناصر کے ساتھ چلنے کے بعد اچانک سوال کیا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انھیں یہاں سے کتنی دور نشانہ بازی کا حکم دیا جائے گا؟"

میر ناصر نے جواب دیا۔ "معظم علی گھبراؤ نہیں۔ تمھیں میر قاسم نے بلایا ہے۔"

"میر قاسم کون، میر جعفر کا داماد؟"

"ہاں۔ میں اکثر ان سے تمھارا ذکر کیا کرتا تھا۔ آج انھوں نے تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر تم عقلمندی کا ثبوت دو تو مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے نتائج تمھارے حق میں برے نہیں ہوں گے۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر میر قاسم یہ سمجھتا ہے کہ قید میں رہ کر میر جعفر کی حکومت کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں تو اسے مایوسی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے یہیں سے واپس لے چلیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میر قاسم کو تمھارے استقلال نے متاثر کیا ہو اور بنگال اور میر جعفر کے متعلق اب اس کے خیالات بھی وہی ہوں جو تمھارے ہیں۔"

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد معظم علی اور میر ناصر، قاسم کے عالیشان مکان میں داخل

ہوئے۔ دیوان خانے کے قریب ایک روشن کمرے کے سامنے پہنچ کر سپاہی رک گئے اور میر ناصر اور معظم علی کمرے میں داخل ہوئے۔ میر قاسم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میر ناصر نے کہا۔ "یہ معظم علی ہے!"

میر قاسم نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ!"

معظم علی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک قیدی کا بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ میر قاسم کچھ دیر بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "معظم علی میں تمھارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور میں نے قید خانہ کے داروغہ کو ہدایت کی تھی کہ تمھیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ جو لوگ سونے میں تولے جانے کے قابل تھے وہ قید خانے میں سڑ رہے ہیں۔ بنگال کو مزید تباہی سے بچانے کی اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اسے میر جعفر کی حکومت سے نجات دلائی جائے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس تباہی کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن ہم غلط فہمی اور غلط اندیشی میں مبتلا تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ میر جعفر حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے بعد ایک اچھا حکمران ثابت ہوگا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی حکومت بنگال کے لیے ایک لعنت ہے۔ وہ ایک کولھو ہے جس سے انگریز بنگال کے عوام کا خون نچوڑنے کا کام لے رہے ہیں۔ اس نے بنگال کے بہترین اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ بنگال کے امراء کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔ میں نے فوج کے محب وطن نوجوانوں سے بات چیت کی ہے۔ وہ میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور میرے ساتھ تعاون کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو قید سے رہا کرانے کی کوشش کروں۔"

معظم علی نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا۔ "میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پہلے آپ کو انگریز کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور انگریز کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

چند افسروں کا تعاون کافی نہیں۔ اس کے لیے عوام کو بیدار اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔"

میر قاسم مسکرایا۔ "موجودہ حالات میں انگریز کے ساتھ لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لارڈ کلایو خود میر جعفر سے تنگ آچکا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "اور اب وہ میر جعفر کی جگہ آپ کو گدی پر بٹھانا چاہتا ہے؟"

میر قاسم نے جواب دیا۔ "میں تمھیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر ہم میر جعفر کو گدی سے اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور لارڈ کلایو کو یہ احساس دلا سکیں کہ اُمراء، سپاہی اور عوام ہمارے ساتھ ہیں تو وہ میر جعفر کا ساتھ دینا پسند نہ کرے گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو میر جعفر کی نسبت زیادہ کارآمد سمجھتا ہے؟"

میر قاسم نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک ذہین آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کہ انگریز کے ساتھ ٹکر لے سکیں لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے حکومت کا موقع ملا اور تمھارے جیسے لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد ایک ایسی طاقت منظم کر سکوں گا جو اس ملک کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر سکے۔"

معظم علی مسکرایا۔ "آپ انگریزوں کی سرپرستی میں اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر ان کے خلاف لڑنے والی فوج منظم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لارڈ کلایو آپ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوگا۔ دیکھیے میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میر جعفر کی حکومت پر مطمئن ہو؟"

"میں کسی ایسی حکومت پر مطمئن نہیں ہو سکتا جسے لارڈ کلایو کی سرپرستی حاصل ہو۔ میں ایک سوراخ میں دوبارہ ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کروں گا۔"

میر قاسم نے مایوس ہو کر کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تمام عمر قید خانہ میں رہنا پسند کرتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں چھوٹے قید خانے سے نکل کر بڑے قید خانے میں نہیں آنا چاہتا۔"

میر قاسم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "فرض کرو اگر میں اپنی ذمہ داری پر تمھیں قید سے آزاد کر دوں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے بنگال کی آب و ہوا راس نہیں آئے گی۔"

میر قاسم نے کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد کہا۔ "اگر اب تمھیں واپس قید خانے میں بھیج دیا جائے تو کیا میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں کسی اور پر ظاہر نہیں ہوں گی؟"

"ہاں! اور اگر آپ واقعی میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں تو قید خانے میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی پھر جس دن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ آپ انگریزوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے قید سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔"

میر قاسم نے سوال کیا۔ "اگر تمھیں اس وقت آزاد کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں بنگال میں نہیں رہوں گا۔"

"جاؤ تم آزاد ہو!"

معظم علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور وہ مسرت اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میر قاسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میر قاسم نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "میری طرف کیا دیکھ رہے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ہو۔ میں کہتا ہوں تم آزاد ہو۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے تمھیں کیوں آزاد کیا ہے تو سنو پلاسی کی جنگ کے بعد میں نے تم جیسے کئی نوجوانوں کو بغاوت کی سزا پاتے دیکھا ہے اور میں ہمیشہ اپنے دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں لیکن آج بنگال پر ہمارا خاندان نہیں بلکہ انگریز حکمران ہے۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک معمولی کلرک میر جعفر کی نسبت زیادہ اختیارات کا مالک ہے، اگر آج سے چند ماہ قبل کوئی شخص تمھاری طرح میری طرف گستاخ نگاہوں سے دیکھتا تو میں اس کی آنکھیں نکال لیتا لیکن اب ہم ہر ذلت کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ادنیٰ ملازم ہمیں آواز دے کر بلانے کی بجائے انگلی کے اشاروں سے بلاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک قیدی کے لباس میں بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔ کاش میں بھی اسی طرح لارڈ کلایو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا۔ تم جا سکتے ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم انگریزوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتے لیکن یاد رکھو! جب کبھی موقع آئے گا ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔"

پھر وہ میر ناصر کی طرف متوجہ ہوا۔ "ناصر! تم نے شرط جیت لی ہے۔ انھیں لے جاؤ اور میرے نوکروں سے کہو انھیں نیا لباس اور گھوڑا دے دیں۔ انھیں مرشد آباد کے باہر پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔"

کمرے سے باہر نکلتے وقت معظم علی، میر قاسم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا کمرے سے باہر نکل کر اس نے میر ناصر سے سوال کیا "آپ نے میر قاسم سے کون سی شرط جیتی ہے؟"

میر ناصر نے جواب دیا "میر قاسم کا خیال تھا کہ آپ قید سے رہائی کی اُمید پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور میری رائے اس کے خلاف تھی، انھوں نے مذاق میں کہا تھا کہ اگر معظم علی مجھے دیکھتے ہی میرے پاؤں پر نہ گر پڑا تو میں تمھیں دس اشرفیاں انعام دوں گا اور میں نے یہ کہا تھا کہ جس معظم علی کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا تھا وہ

اور ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی نے کہا۔ "میں اپنی رہائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ میر جعفر اور میرن کو جب میرے متعلق معلوم ہوگا تو آپ لوگ کیا جواب دیں گے؟"

میر جعفر اور میرن ان دنوں انگریزوں کے لیے روپیہ جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے اور پھر میر قاسم اتنے بے اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک قیدی بھی رہا نہ کر سکیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ فوراً مرشد آباد سے نکل جائیں اور جلد از جلد بنگال کی سرحد عبور کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دو دن بعد یہ خبر مشہور کرنی پڑے کہ ایک خطرناک قیدی کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ میر قاسم کے سپاہی آپ کو شہر کے باہر چھوڑ آئیں گے۔"

معظم علی نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں یہاں سے تنہا جاؤں۔ میرے ساتھ سپاہی دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ میری طرف متوجہ ہوں گے۔ میرا تنہا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں شہر چھوڑنے سے پہلے چند منٹ کے لیے اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

میر ناصر نے کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کا گھر نیلام ہو چکا ہے اور اب وہاں کوئی اور رہتا ہے۔"

معظم علی نے کہا "میں اپنے نوکر کو تلاش کیے بغیر نہیں جا سکتا۔ محلے میں میرے کئی دوست ہیں شاید انھیں اس کا پتہ ہو۔ میرے لیے وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر میں پکڑا گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ نے قید سے نکالا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

میر ناصر نے کہا "اگر نوکر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے تو میں آپ کو نہیں روک سکتا لیکن آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بہت سے قیدیوں کو رہا کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"میں پوری احتیاط کروں گا۔ اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرزا حسین بیگ مرشدآباد سے ہجرت کرنے کے بعد کہاں گئے تھے؟"

"میں ان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ لکھنؤ کی طرف جا رہا تھا اور قافلے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنؤ سے آگے آگرہ، دہلی اور حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ میر ناصر نے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں۔ میں آپ کے لیے نئے لباس اور گھوڑے کا انتظام کرتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر بارِ خاطر نہ ہو تو مجھے ایک خنجر کی بھی ضرورت ہے۔"

میر ناصر نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا۔ "میں آپ کو خنجر کے علاوہ بندوق اور پستول بھی دے سکتا ہوں۔"

○

قریباً ایک گھنٹہ بعد معظم علی ایک فوجی افسر کا لباس پہنے اپنے محلے کی ایک سنسان گلی میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"عبداللہ خان! دروازہ کھولو۔"

مکان کا دروازہ کھلا اور معظم علی نے جلدی سے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "عبداللہ! میں معظم علی ہوں۔"

عبداللہ خاں چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں معظم علی نے اپنا گھوڑا اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا۔

عبداللہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور بولا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "باتوں کا وقت نہیں، یہ بتاؤ کہ صابر کہاں ہے؟"

"صابر آپ کے مکان میں رہتا ہے۔ آپ کی گرفتاری کے بعد حکومت نے آپ کا مکان نیلام کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک فوجی افسر مقیم ہے اور صابر اس کے پاس نوکر ہے۔ مرزا حسین بیگ ہجرت کے وقت صابر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے کہا۔ میں مرتے دم تک اس مکان میں معظم علی کا انتظار کروں گا۔"

معظم علی نے کہا: "تمہیں معلوم ہے کہ مکان کے مردانہ حصے میں اس وقت صابر کے ساتھ اور کون ہوگا؟"

"وہاں اگر کوئی مہمان نہیں تو ایک اور نوکر ضرور ہوگا۔"

مکان کی چھت سے ایک عورت نے آواز دی: "یہ کون ہیں؟"

"ایک دوست ہیں۔" عبداللہ نے جواب دیا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ قیدخانے سے اس وقت باہر کیسے نکلے؟"

معظم علی نے کہا: "ان باتوں کا وقت نہیں۔ تم اسی وقت تین چار قابلِ اعتماد دوستوں کو بلا لاؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی عبداللہ کے علاوہ اپنے محلے کے چار اور نوجوانوں کے ساتھ جنہوں نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے تھے، اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رکا۔ چاند کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ دیوار پھاند کر صحن میں داخل ہوا۔ صحن میں اصطبل کے سامنے دو آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی دبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عبداللہ اور اس کے باقی ساتھی صحن میں داخل ہوئے اور معظم علی کے اشارے پر اصطبل کے سامنے سونے والوں کی کھاٹوں کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے ایک کھاٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک قوی ہیکل نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر جگایا اور ہاتھ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کہا۔ "تمھاری خیر اسی میں ہے کہ تم خاموش رہو۔"

اپنے گرد مسلح آدمی دیکھ کر اس نے مزاحمت کی کوشش نہ کی اور معظم علی کے ساتھیوں نے اسے منہ میں اچھی طرح کپڑا ٹھونس کر اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیا۔

اس کے بعد معظم علی نے دوسرے آدمی کو جگایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "صابر خاموش! ڈرو نہیں، میں معظم علی ہوں۔"

اور صابر کی حیران بے بس اور خاموش نگاہیں ایک ثانیہ کے اندر اندر ہزاروں سوالات کر چکی تھیں۔

معظم علی نے کہا: "صابر میرے ساتھ آؤ اور باقی سب یہیں ٹھہریں ہم ابھی آتے ہیں۔"

صابر کچھ کہے بغیر معظم علی کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوا۔ کھلے دروازوں کے راستے چاند کی روشنی اصطبل کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کھرلی پر دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے معظم علی نے کہا۔ "صابر تم جلدی سے گھوڑوں پر زین ڈالو۔"

اس کے بعد وہ کھرلی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور آخری کھونٹے کے قریب بیٹھ گیا۔ جب صابر گھوڑوں پر زین ڈالنے کے بعد اس کے پاس آیا تو وہ خنجر سے زمین کھود رہا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"صابر میں چوری کر رہا ہوں۔"

"چوری! کس چیز کی چوری؟"

"میں اپنے گھر میں اپنے مال کی چوری کر رہا ہوں۔ تم گھوڑے باہر لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

صابر گھوڑے کی باگ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنی بغل میں ایک چھوٹی سی تھیلی دبائے باہر نکلا تو اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا: "یہ کیا ہے؟"

"یہ ہمارا زادِ راہ ہے۔ آؤ اب چلیں!"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد محلے سے باہر معظم علی اور صابر گھوڑوں پر سوار ہو کر عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر سوال کیا۔ "آپ کی منزل کہاں ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں۔ میں مرزا حسین بیگ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر لکھنؤ میں نہ ملے تو میں دلی جاؤں گا۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو مجھے حیدرآباد جانا ہوگا۔ اس کے بعد خدا معلوم مجھے کن کن شہروں اور بستیوں کی خاک چھاننی پڑے۔"

عبداللہ خاں نے کہا: "میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ آپ کی گرفتاری کے کوئی چھ مہینے بعد اکبر خاں یہاں آیا تھا وہ دو دن میرے پاس ٹھہرا تھا اور جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر خدا نے مجھے توفیق دی تو میں ایک فوج لے کر مرشدآباد آؤں گا اور معظم بھائی کو قید سے نکالوں گا۔"

معظم علی نے سوال کیا: "تم نے اس سے مرزا حسین بیگ کے متعلق پوچھا تھا؟"

"ہاں، لیکن مرزا حسین بیگ کے متعلق وہ بھی بے خبر تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ میں لکھنؤ جا کر انھیں تلاش کروں گا اور اگر وہ مل گئے تو انھیں اپنے گھر لے جانے کی کوشش کروں گا۔"

صابر نے کہا: "اکبر خاں مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے جواب دیا کہ میں مرتے دم تک اپنے آقا کا انتظار کروں گا"

گھوڑے پر سوار ہوتے وقت معظم علی نے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں سے کہا: "آپ لوگ میرے فرار ہونے کے متعلق محلے کے کسی اور آدمی سے ذکر تک نہ کریں۔ میر جعفر کے آدمیوں کو اگر اس کا علم ہو گیا تو وہ یقیناً ہمارا پیچھا کریں گے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

علی الصباح معظم علی اور صابر نے ایک برساتی ندی کے کنارے گھوڑوں سے اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ یہ آنسو ایک لٹے ہوئے مایوس اور بے بس انسان کی آخری پونجی تھے جسے وہ اپنے وطن کی خاک پر نچھاور کر رہا تھا۔ معظم علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جزا اور سزا کے مالک میری بدنصیب قوم کو چند افراد کی بداعمالیوں کی سزا نہ دے۔ ہمیں ان ملت فروشوں سے نجات دلا جنھوں نے تیرے بندوں کو تیری رحمت سے مایوس کر دیا ہے!"

○

"آپ مرزا حسین بیگ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ — وہ مرشد آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ شاید یہاں ان کے کوئی رشتہ دار تھے — آپ کسی ایسے آدمی کا پتہ دے سکتے ہیں جو پلاسی کی جنگ کے بعد مرشد آباد سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہوا ہو؟" یہ وہ سوالات تھے جو معظم علی لکھنؤ میں چند دن قیام کے دوران سیکڑوں آدمیوں سے پوچھ چکا تھا لیکن کہیں سے اسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔

لکھنؤ پہنچ کر معظم علی نے دو دن ایک سرائے میں گزارے۔ تیسرے دن اس نے اپنی تھیلی سے ایک ہیرا نکالا اور بارہ سو اشرفی کے عوض لکھنؤ کے ایک جوہری کے پاس فروخت کر دیا۔ اسی شام اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اس کے بعد اس کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھتا اور اپنے تکیے کے نیچے سے جواہرات کی تھیلی نکال کر اپنی کمر میں باندھ لیتا اور پھر محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد حسین بیگ کی تلاش میں نکل جاتا۔ زیورات اس نے ایک صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اس کی حفاظت صابر کے سپرد کر دی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے اس نے ایک اور نوکر رکھ لیا تھا جس کا

www.allurdu.com

نام دلاور خاں تھا۔ سارا دن شہر کے محلوں اور گلیوں میں حسین بیگ کو تلاش کرنے کے بعد شام کو تھکاوٹ اور تھکاوٹ سے زیادہ مایوسی سے نڈھال ہو کر وہ گھر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ ہیروں کی تھیلی کمر سے کھول کر تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ صابر کے سوا کسی کو اس کی دولت کا علم نہ تھا۔ اپنے خزانے کا سب سے چھوٹا ہیرا فروخت کرنے کے بعد معظم علی کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ملک کے چند امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے لیکن اس دولت کے ساتھ ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

ایک امیر آدمی کے لباس میں اسے لکھنؤ کے رؤسا، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دس دن کی پیہم جستجو کے بعد ایک دوپہر وہ لکھنؤ کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ آدمی اس کے سامنے آ کر اچانک رکا اور اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد "معظم علی! معظم" کہتا ہوا لپٹ گیا۔

"آپ شیر علی ہیں؟" معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ہاں" اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے آسانی سے نہیں پہچانو گے۔ مجھے یہاں مرشد آباد کے کئی آدمی ملے ہیں لیکن ایک دو کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچان سکا اور تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ تم قید سے کب رہا ہوئے اور یہاں کب آئے؟"

"میں کوئی دس روز سے یہاں ہوں اور مرزا حسین بیگ کو تلاش کر رہا ہوں۔ شاید آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو؟"

شیر علی نے جواب دیا۔ "مرزا صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ "میں نے ان سے ایک ماہ بعد مرشد آباد سے ہجرت کی تھی۔ لکھنؤ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

پہنچ کر مجھے چند ایسے آدمی ملے جو مرشد آباد سے مرزا صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ مجھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ مرزا صاحب اودھ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیمار ہوگئے تھے اور ایک بستی کے زمیندار نے انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ایک ماموں زاد بھائی رہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ مرزا صاحب ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب میں نے انھیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسی کی جنگ سے چند ماہ قبل لکھنؤ سے ہجرت کرکے دکن جا چکے ہیں۔ پھر میں نے اس بستی کا رخ کیا جہاں مرزا صاحب کے ٹھہرنے کی اطلاع ملی تھی لیکن وہاں پہنچ کر گاؤں کے زمیندار سے یہ خبر سنی کہ وہ چار دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اور انھیں گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ گاؤں کے زمیندار نے مجھے ان کی قبر بھی دکھائی تھی۔"

معظم علی نے کہا: "لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی اور لڑکی بھی تھیں؟"

"انھیں گاؤں کے زمیندار نے چند دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔ اس کے بعد بنگال سے تارکان وطن کا ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا۔ وہ اس قافلے کے ساتھ شامل ہوگئیں اس قافلے میں بعض آدمی لکھنؤ اور فیض آباد اور بعض آگرہ اور دلی جانے والے تھے۔ میں نے لکھنؤ واپس آکر پتہ کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان کے ساتھ دو نوکر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ سے اپنے عزیزوں کا پتہ کرنے کے بعد دلی یا حیدرآباد جا چکی ہیں۔ کیونکہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد ان دونوں شہروں میں ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا: "آپ کو مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی کا نام معلوم ہے؟"

"ہاں، ان کا نام ارشد بیگ تھا۔"

"آپ کو دہلی میں ان کے کسی رشتہ دار کا نام معلوم ہے؟"

"نہیں۔"

شیر علی کا لباس اس کی مفلسی اور تنگ دستی کا آئینہ دار تھا۔

معظم علی نے پوچھا: "یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟"

شیر علی نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ جب میں مرشد آباد سے آیا تھا تو میرے پاس کچھ روپیہ تھا۔ یہاں ایک ساتھی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم بنارس چل کر کوئی کاروبار شروع کریں بنارس جا کر میں تجارت میں نفع کمانے کی بجائے اپنی رہی سہی پونجی بھی گنوا بیٹھا اور اب کسی ملازمت کی تلاش میں ہوں لیکن یہاں ایک بوڑھے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کو ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں چلیے میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"میرے مکان پر۔"

"لیکن میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو ممکن ہے میں آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں"

"لیکن تجارت کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے؟"

"سرمائے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

شیر علی نے کہا۔ "میں اپنی خاطر آپ کو تجارت کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ ایک سپاہی ہیں اور اپنے تجربے اور ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اودھ کی فوج میں بہترین عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "چچا شیر علی خدا کے لیے فوج کی ملازمت کا ذکر نہ کیجیے۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی عمر ان نام نہاد حکمرانوں کے لیے تلوار نہیں اٹھاؤں گا، جنھوں نے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

قوم کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔"

معظم علی نے دو ہفتے اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں وہ صبح سے شام تک فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ رات کے وقت جب کبھی شیر علی کو اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہتا "معظم اگر تمھارے پاس قارون کا خزانہ ہو تو بھی ہمیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی کام شروع کرنا پڑے گا۔" معظم علی جواب دیتا۔ "ہاں چچا جان میں سوچ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو بہت جلد کسی کام پر لگا دیا جائے گا۔"

ایک رات تیسرے پہر شیر علی سو رہا تھا۔ معظم علی نے اسے جگایا اور کہا۔ "چچا شیر علی میں کچھ عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ دلاور خاں میرے ساتھ جائے گا اور صابر آپ کی خدمت میں رہے گا۔ یہ لیجیے اس تھیلی میں پانچ سو اشرفیاں ہیں۔ میری غیر حاضری میں آپ کے اخراجات کے لیے یہ کافی ہوں گی۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" شیر علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"میرا مقصد فرحت اور اس کی والدہ کو تلاش کرنا ہے۔ میں پہلے فیض آباد جاؤں گا۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ ایک دوست کے پاس جاؤں گا۔ پھر ممکن ہے مجھے آگرہ، دلی اور حیدرآباد کی خاک چھاننی پڑے۔"

شیر علی نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، اس عمر میں آپ کے لیے اتنا طویل سفر ٹھیک نہیں۔ میری واپسی تک آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں کون سا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور دلاور خاں گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے اور شیر علی اور صابر مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دلاور خاں کوئی چالیس برس کا ایک دراز قامت، قوی ہیکل آدمی تھا اور چند دنوں میں معظم علی کا قابلِ اعتماد ساتھی

بن چکا تھا۔

○

گھنے جنگل میں غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہی شام کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اداس اور مغموم فضا میں معظم علی اور دلاور خاں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں پر معمولی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے کبھی کبھی کوئی گیدڑ، خرگوش، ہرن یا بھیڑیا گھنے درختوں سے نمودار ہوتا اور پگڈنڈی عبور کر کے دوسری طرف روپوش ہو جاتا۔

ایک چھوٹی سی ندی عبور کرنے کے بعد معظم علی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہاں سے تھوڑی دور آگے دائیں ہاتھ ایک اور پگڈنڈی آئے گی جو اکبر خاں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ ذرا خیال رکھنا اگر ہم اس پگڈنڈی سے آگے نکل گئے تو ساری رات جنگل میں بھٹکتے رہیں گے۔"

دلاور خاں نے جواب دیا۔ "جناب بھٹکنے کے لیے یہ جنگل موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے تو یہ بہتر تھا ہم پچھلی بستی میں رک گئے ہوتے۔"

معظم علی نے کچھ کہنے کی بجائے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک پگڈنڈی دکھائی دی اور اس نے اپنا گھوڑا موڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہم پہنچ گئے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک ٹیلہ ہے۔ ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے کنارے تھوڑی دور جائیں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹیلہ آئے گا جسے عبور کرنے کے بعد ہم جنگل سے نکل کر اکبر خاں کے گاؤں کے کھیتوں میں داخل ہو جائیں گے۔"

دلاور خاں کچھ کہے بغیر معظم علی کے پیچھے ہو لیا۔ تنگ پگڈنڈی پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب پہنچتے ہی گھوڑوں نے ٹھٹھک کر کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ معظم علی اور دلاور خاں پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ انھیں کسی بکرے کی ممیاہٹ سنائی دی۔ دلاور خاں نے اطمینان کا سانس

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

لیتے ہوئے کہا۔" اگر یہ کسی ریوڑ سے بچھڑے ہوئے بکرے کی آواز نہیں تو ہم کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں آس پاس کوئی بستی نہیں اور ایسے جنگل میں بکرے اپنے ریوڑ سے بچھڑنا پسند نہیں کرتے۔" معظم علی نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ بدحواس گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں لیکن ٹیلے کی چوٹی سے کوئی بیس قدم دور پہنچ کر آگے بڑھنے کی بجائے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ معظم علی نے مڑ کر دیکھا تو دلاور خاں کا گھوڑا بھی الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا معظم علی اپنی بندوق سنبھال کر گھوڑے سے اتر پڑا اور دلاور خاں نے اس کی تقلید کی۔

معظم علی نے کہا۔" تم گھوڑے سنبھالو۔ معلوم ہوتا ہے انھیں کسی درندے کی بُو آ گئی ہے۔ میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔"

دلاور خان نے گھوڑوں کی باگیں پکڑلیں۔ معظم علی نے گھنے جنگل میں اِدھر اُدھر دیکھا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹیلے سے آگے ایک چھوٹی سی جھیل تھی اور پگڈنڈی جھیل کے کنارے ایک نصف دائرہ بنانے کے بعد دوسری جانب درختوں میں غائب ہوجاتی تھی۔ جھیل کے کنارے درخت نسبتاً کم تھے۔ بکرے کی کرب انگیز چیخیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ معظم علی نے پیچھے مڑ کر دلاور خاں کو اشارہ کیا اور وہ اچھلتے کودتے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو کھینچتا آگے بڑھا۔

معظم علی نے کہا۔" اگر میں غلطی پر نہیں تو عنقریب ہم کسی شکاری سے ملنے والے ہیں۔ بکرا جھیل کے کنارے پگڈنڈی کے پاس ہی کسی درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے اور شیر یا چیتا بھی کہیں آس پاس چکر کاٹ رہا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے یہاں سے جلد نکل جانا بہتر ہے۔ تم گھوڑوں کو جھیل کے ساتھ ساتھ رکھو اور میں جنگل کی طرف رہوں گا۔"

دلاور خاں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔" خدا کی قسم میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن اس بکرے کی ہر چیخ کے ساتھ میرا ایک سیر خون خشک ہوا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی بھوت نہیں تو آپ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں!"

ٹیلے سے نیچے اترتے ہی معظم علی کو اپنے دائیں ہاتھ گھنی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اسے ایک شیر دکھائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی۔ شیر ایک ثانیہ کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک خوفناک گرج کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ معظم علی نے گولی چلادی۔ زخمی درندے نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر پوری قوت سے آخری جست لگاکر معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر ڈھیر ہوگیا۔

معظم علی ایک لمحہ کے لیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اپنے تھیلے سے بارود نکال کر بندوق بھرنے لگا۔ ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مبہوت سا ہوکر رہ گیا۔ ایک شیرنی کوئی پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ سے نمودار ہوئی اور دھاڑتی ہوئی معظم علی کی طرف بڑھی۔ معظم علی کے لیے بندوق بھرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بندوق پھینک دی اور جلدی سے تلوار نکال کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں ایک درخت کی جڑ کے ساتھ ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل کی فضا بندوق کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ معظم علی جو ایک ثانیہ قبل موت کا بھیانک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اٹھا تو اسے صرف چار قدم کے فاصلے پر شیرنی دم توڑتی دکھائی دی۔ پھر اسے ایک دلکش آواز سنائی دی۔" آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔"

معظم علی جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک درخت

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی آڑ سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور فاتحانہ انداز سے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔

"بھائی جان!" وہ قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلّایا اور اپنی بندوق پھینک کر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

"اکبر — تم .... تم اتنی جلدی جوان ہو گئے؟"

اکبر نے کہا: "بھائی جان شیر مارنے کے بعد آپ کو اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ شیرنی آپ کے سر پر آ چکی تھی۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں بندوق بھر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بر وقت پہنچ گئے۔ میں نے بکرے کی چیخیں سن کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جنگل میں کوئی شکاری موجود ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "اس جوڑے نے ہمارے کئی مویشی ہلاک کیے ہیں۔ اس لیے میں نے آج بکرا بندھوا دیا تھا۔ جب آپ ٹیلے سے نیچے اتر رہے تھے میں نے شیر کو آپ کی تاک میں جاتے دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف آ نکلا ہے میں آپ کو خبردار کرنے کی نیت سے نیچے اترا لیکن آپ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو چکے تھے، پھر میں بندوق کی آواز سن کر اس طرف بھاگا تو یہ شیرنی نظر آئی — میں مرشد آباد گیا تھا آپ قید سے کب رہا ہوئے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اکبر ہم اس جنگل سے نکل کر اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔"

"چلیے۔" اکبر خاں نے کہا۔ "یہ آپ کا ساتھی کون ہے۔ میں نے اسے جھیل کے کنارے بدحواس گھوڑوں سے زور آزمائی کرتے دیکھا ہے۔"

"وہ میرا نوکر ہے۔"

وہ اپنی اپنی بندوقیں اٹھا کر چل پڑے۔ راستے میں اکبر خان کے تین اور ساتھی ان کے

ساتھ شامل ہو گئے۔ جھیل کی طرف دلاور خاں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے نکل کر انھیں ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔ دلاور خاں کنارے سے چند قدم دور جھیل کے اندر وحشت زدہ گھوڑوں کی باگیں پکڑے انھیں بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ ایک دیہاتی جس نے ایک ہاتھ سے بکرے کا رسّہ پکڑ رکھا تھا، کنارے پر کھڑا ملے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک گھوڑے نے اچانک اچھل کر دلاور خاں کے ہاتھ سے باگ چھڑا لی اور چند قدم دور نکل گیا۔ دلاور خاں کو اس پریشانی کی حالت میں دیہاتی کی ہنسی بے حد ناگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "ارے یار تم عجیب بیوقوف ہو۔ بھلا یہ ہنسنے کی کونسی بات ہے خدا کے لیے اس بکرے کو یہاں سے لے جاؤ یہ بیوقوف جانور اسے بھی شیر سمجھتے ہیں۔"

دیہاتی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایلے نہیں گھوڑے، بکرے کو شیر نہیں سمجھتے بلکہ تمھیں بھوت سمجھ کر ڈر گئے ہیں۔"

دلاور خاں کو انتہائی بے بسی کی حالت میں بھی بھوت کہلانا پسند نہ تھا۔ وہ دیہاتی کو جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ معظم علی اور دوسرے آدمیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کا سارا غصّہ جاتا رہا اس نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم نے دو شیر مار لیے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ تم باہر آ جاؤ!"

دلاور خاں نے آزردہ ہو کر کہا۔ "واہ جی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیر سے ڈر کر پانی میں گھس گیا تھا۔ خدا کی قسم یہ گھوڑے نہیں گدھے ہیں۔ اگر پھر کبھی ایسا وقت آیا تو میں انھیں سنبھالنے کی بجائے شیر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیرنا آتا ہے ورنہ آپ کو میری لاش بھی نہ ملتی۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

اکبر خاں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "نہیں بھائی اس طرف جھیل کا پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اگر تمھیں تیرنا نہ آتا تو بھی ڈوب جانے کا خطرہ نہ تھا۔"

معظم علی نے کہا۔" دلاور خاں اب تم شور مچانے کی بجائے باہر نکل آؤ تو گھوڑے خود بخود ہمارے پاس آئیں گے۔"

" نہیں جناب! جب تک یہ بکرا کنارے پر کھڑا ہے۔یہ باہر نہیں نکلیں گے۔"

" بھئی تم باہر تو نکلو!"

دلاور خاں نے بددل ہوکر گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دیں اور خود پانی سے باہر نکل آیا جب وہ کنارے پر پہنچا تو گھوڑے بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آرہے تھے۔ دلاور خاں نے کہا۔" خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گولی مار دوں!"

اکبر خاں کے اشارے پر دو آدمیوں نے گھوڑے پکڑ لیے اور یہ لوگ جھیل کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر چل دیئے۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل میں گیدڑوں، بھیڑیوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم علی، اکبر خاں کے ان گنت سوالات کے جواب میں اسے اپنی قید اور رہائی کی داستان سنا رہا تھا۔ جب اس نے اپنی سرگذشت ختم کی تو اکبر خاں نے کہا۔" اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ پہنچ گئے ہیں تو میں فوراً وہاں آتا۔"

" لکھنؤ میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔ میں وہاں سے فیض آباد چلا گیا تھا اور فیض آباد سے اودھ کے چند شہروں کی خاک چھاننے کے بعد تمھارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تمھیں مرزا صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہو۔"

اکبر خاں نے مغموم لہجے میں کہا۔" کاش مجھے کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے مرشد آباد سے واپسی پر لکھنؤ میں انھیں تلاش کیا تھا۔ اب اگر آپ دلی، آگرہ اور حیدر آباد جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

www.allurdu.com

معظم علی نے سوال کیا۔" تمھارے بھائی جان کا کیا حال ہے؟"

" بھائی جان کو فوت ہوئے قریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ ہمارے علاقے پر مرہٹوں نے حملہ کر دیا تھا اور وہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔"

چند ثانیہ معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اکبر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" اکبر مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔" بھائی جان نے ایک بہادر کی طرح جان دی تھی۔ ان کے جسم پر تین گولیوں کے اور پانچ تلوار کے زخم تھے۔"

معظم علی نے پانچ دن اکبر خاں کے گھر قیام کیا۔ اس کے بعد جب اس نے آگرہ اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خاں نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن معظم علی نے کہا۔" اکبر خاں تم اب اپنے علاقے کے سردار ہو۔ تمھارا گھر رہنا ضروری ہے۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، لیکن تم میرے ساتھ جا کر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

اکبر خاں نے کہا۔" بھائی جان میں آپ کی خاطر نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مجھے آگرہ اور دلی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں حیدر آباد بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں چچا جان کے ہوتے ہوئے میری غیر حاضری بہت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی۔"

معظم علی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔" بہت اچھا اگر تمھارا یہی ارادہ ہے تو پھر تیار ہو جاؤ ہم پرسوں صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔" میں بالکل تیار ہوں۔"

تیسرے روز رات کے پچھلے پہر اکبر خاں نے معظم علی کو جگایا اور کہا۔" بھائی جان اٹھیے اب صبح ہونے والی ہے۔"

معظم علی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں کی قطار دکھائی دی۔ اکبر خاں کا چچا چند مسلح نوجوانوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی نے اکبر خاں سے سوال

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کیا یہ یہ سب آدمی ہمارے ساتھ جائیں گے؟"

"چچا جان تو بیس آدمی بھیجنے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں آٹھ آدمی لے جانے پر رضا مند کیا ہے۔"

اکبر خاں کے چچا نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمھیں زیادہ آدمی لے جانے چاہئیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "چچا جان ہم دلّی دیکھنے جا رہے ہیں، دلّی لوٹنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔"

"برخوردار! دلّی لوٹنے کے لیے تمھیں یہاں سے آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ اگر تم لال قلعہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دو کہ میں دلّی لوٹنے آیا ہوں تو وہیں سے تمھیں ہزاروں مددگار مل جائیں گے۔ تمھیں راستے میں اپنی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ اکبر خاں کا خیال رکھیں۔ یہ آٹھ آدمی جنھیں میں آپ کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ ہمارے قبیلے کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ خطرے کے وقت آپ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گیارہ آدمیوں کا یہ قافلہ گاؤں سے باہر نکل رہا تھا۔

گیارھواں باب

دلی تک سفر کے دوران میں معظم علی کے تمام خیالات فرحت پر مرکوز تھے۔ وہ راستے کے پر رونق شہروں سے مایوس ہو کر نکلتا تو اپنے دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا کہ فرحت آگے کسی بستی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر جب اسے بستی کے لوگوں سے مل کر مایوسی ہوتی تو اس کی نگاہیں فرحت کو راستے کے جنگلوں اور بیابانوں میں تلاش کرتیں۔ کبھی کوئی قافلہ نظر پڑتا تو وہ قریب جا کر پوچھتا: "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ مرشد آباد کا کوئی آدمی تو نہیں؟" مسافر اس کی باتوں پر مسکراتے اور ہنستے گزر جاتے، پھر وہ اکبر خاں سے کہتا۔ "اکبر شاید میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس قافلے میں نہیں ہوں گی لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے دلی پہنچ کر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ اب موہوم امیدیں میری زندگی کا آخری سہارا بن چکی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ لا کر پریشان کیا۔"

اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: "بھائی جان آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک شام دلی سے دو منزل ادھر وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کا چودھری ایک شریف النفس راجپوت تھا۔ اس نے انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ جب معظم علی نے اسے یہ بتایا کہ میں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی تلاش میں دلی جا رہا ہوں۔ تو عمر رسیدہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

میزبان نے کہا "برخوردار مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ لوگ اس شان و شوکت کے ساتھ دلّی گئے تو آپ کے باقی عزیز شاید تمام عمر آپ کو تلاش کرتے رہیں۔ دلّی پر اب مرہٹوں کا راج ہے۔ وہاں آپ کا لباس، آپ کے گھوڑے اور آپ کے ہتھیار آپ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ پھر اگر آپ مرہٹوں کی نگاہ سے بچ کر شہر میں داخل ہو جائیں تو بھی ہزاروں آدمی وہاں آپ کے لیے سر دردی کا باعث ہوں گے۔ دلّی میں اگر آپ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو آٹھ دس آدمی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوں تو کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو کہ آپ بہت امیر ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا "میں راستے میں دلّی کے حالات سن چکا ہوں اور اتنے آدمیوں کو وہاں لے جانا میں بھی عقلمندی نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں اگلی منزل سے واپس کر دوں گا یا راستے کی کسی بستی میں چھوڑ دوں گا اور اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس ٹھہرا سکیں تو بہت نوازش ہوگی۔"

میزبان نے جواب دیا "میرے پاس آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت جگہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنا گھوڑا یہیں چھوڑ دیں۔ میرے گاؤں سے کل اناج کے چند چھکڑے دلّی جا رہے ہیں اور اگر آپ ایک عام دیہاتی کا لباس پہننا پسند کریں تو میں آپ کو ان کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا "مجھے ننگے پاؤں چلنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میرے باقی ساتھی میری واپسی تک یہاں رہیں گے۔" پھر وہ اکبر خاں کی طرف متوجہ ہوا "اکبر خاں تم اگر واپس نہیں جانا چاہتے تو تمھیں چند دن یہاں رہنا پڑے گا۔ میں صرف دلاور خاں کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

اکبر خان نے بضد ہو کر کہا "نہیں بھائی جان میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔

آپ دلاور خاں کو میرے نوکروں کے ساتھ چھوڑ دیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں اکبر تمھارا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔"

اکبر خاں نے میزبان کی موجودگی میں معظم علی کے ساتھ بحث کرنا پسند نہ کیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ لوگ ایک چھوٹی سی حویلی کے صحن میں سو رہے تھے۔ اکبر خاں نے آواز دی ——

"بھائی جان!"

"کیا ہے اکبر؟ تمھیں نیند نہیں آتی؟" معظم علی نے اپنی چارپائی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا!

"نہیں بھائی جان! میں سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جانا چاہتے۔"

"اکبر اگر دلّی کے حالات ٹھیک ہوتے تو میں یقیناً تمھیں بھی ساتھ لے جاتا۔"

"دلّی کے حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ پھر وہاں جانے میں اگر آپ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔"

معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "اکبر تمھیں یہاں ٹھہرانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ سنو میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دلّی لے جانا خطرناک ہے اور یہ چیز میں تمھارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کی حفاظت کر

اکبر خاں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "وہ کیا چیز ہے بھائی جان؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر معظم علی نے اپنی قمیص کے نیچے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی اتاری اور اکبر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو!"

اکبر خاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا کر تھیلی پکڑ لی اور پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

"ہیرے" معظم علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔" اس تھیلی کو اپنی کمر کے ساتھ باندھ لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

اکبر خاں نے کہا۔" اگر یہ سچ مچ ہیرے ہیں تو یقین رکھیے کہ اب آپ کی واپسی تک مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی نیند نہیں آئے گی۔"

اکبر یہ تمھاری نیند سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اب آرام سے سو جاؤ اور دیکھو اگر مجھے زیادہ دلی ٹھہرنا پڑا تو میں دلاور خاں کو واپس بھیج دوں گا۔ پھر تمھارے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم یہاں ٹھہرنے کی بجائے گھر چلے جاؤ اور میں اگر زندہ رہا تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

○

تیسرے دن معظم علی اور دلاور خاں گاڑی بانوں کے لباس میں دلی پہنچے۔ شہر کے ناکوں پر مرہٹہ سپاہی باہر سے آنے والے ہر سفید پوش کی تلاشی لیتے تھے اور اس کی جیب سے جو کچھ نکلتا تھا وہ بحق مرہٹہ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات شہر میں داخل ہونے والوں کو اپنے اجلے کپڑوں کے بدلے کسی مرہٹہ سپاہی کا بوسیدہ لباس زیب تن کرنا پڑتا تھا لیکن شہر میں غلہ، سبزی اور ایندھن پہنچانے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ معظم علی نے جامع مسجد سے تھوڑی دور ایک سرائے میں قیام کیا اور تھوڑی دیر بعد بازاروں، گلیوں اور خانقاہوں میں فرحت اور اس کی ماں کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے سرائے کے مالک کے توسط سے چند منادی کرنے والوں کو بلایا اور انھیں مرشد آباد سے مرزا حسین بیگ کے کسی شناسا کا سراغ لگانے کے کام پر لگا دیا۔

دلی میں قیام کے دوران میں معظم علی نے مسلمانوں کی زبوں حالی کے جو مناظر دیکھے وہ انتہائی دلخراش تھے۔ نام نہاد شہنشاہ کی حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ امرا ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ لال قلعہ سے باہر لٹیروں اور رہزنوں کی بادشاہت تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں مرہٹہ سپاہیوں کے گھوڑے دوڑتے

www.allurdu.com

تھے۔ شہنشاہ کے تمام احکامات مرہٹہ فوج کے سردار کی خواہشات کے مطابق ہوتے تھے۔ دلی سے آگے مرہٹوں کی جارحیت کا سیلاب لاہور، ملتان اور سرہند کا رخ کر رہا تھا غرض شمال مغربی ہندوستان، بھیڑیا خصلت انسانوں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن گیا تھا۔ مسلمانوں کے وہ دفاعی قلعے جو اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کیے تھے، ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ دور دراز شہروں اور بستیوں کے لوگ اپنے شہنشاہ اور اس کے وزیروں اور امیروں کے پاس فریادیں لے کر آتے لیکن دلی پہنچ کر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ لال قلعہ کے مکین ان سے زیادہ مجبور، ان سے زیادہ بے بس اور مظلوم ہیں۔ ستم رسیدہ انسانیت کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی۔ انسانیت اور شرافت کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسلمان چھپ چھپ کر مسجدوں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں دعائیں کرتے تھے علمائے دین احمد شاہ ابدالی کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے:" مرہٹوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اب آپ اس ملک کے مظلوم انسانوں کا آخری سہارا ہیں۔"

معظم علی آٹھ دن دلی میں سرگرداں رہا۔ اس عرصہ میں اسے مرشد آباد کے کئی آدمی ملے جنھوں نے مرزا حسین بیگ کے ساتھ ہجرت کی تھی لیکن اس سے زیادہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ علالت کے باعث راستے کی ایک بستی میں رک گئے تھے۔

ایک شام معظم علی دن بھر کی جستجو کے بعد سرائے میں پہنچا تو اس کے کمرے میں ایک عمر رسیدہ آدمی دلاور خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے اٹھ کر کہا۔ "جناب یہ مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار ہیں۔" معظم علی کا دل دھڑکنے لگا۔

عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔" مرزا حسین بیگ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ آج میں نے جامع مسجد میں یہ اعلان سنا کہ آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔"

معظم علی کا دل بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔" مرزا صاحب وفات پا چکے ہیں۔ میں ان کے بال بچوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا: "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے نوکر نے ابھی مجھے ان کے گھر کی تباہی کے واقعات سنائے ہیں۔ اگر ان کے بال بچے آپ کو لکھنؤ میں نہیں ملے تو آپ کو حیدرآباد جانا چاہیئے۔"

معظم علی نے کہا۔ "مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد جا چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ میں ان کا پتہ کرنے کے بعد حیدرآباد چلی گئی ہوں لیکن میں نے سنا تھا کہ مرزا صاحب کے کئی عزیز دلی میں بھی ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو زیادہ قریبی ہو ممکن ہے وہ یہاں آئے ہوں۔"

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "یہاں مرزا صاحب کے خالو کے دو لڑکے رہتے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجبار تھا اور چھوٹے کا نام عبدالکریم تھا۔ عبدالجبار کوئی چار سال قبل فوت ہو گیا تھا اور عبدالکریم اور اس کے خاندان کے باقی افراد ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ دکن میں وہ کہاں رہتے ہیں۔ بہرحال حیدرآباد سے یقیناً آپ کو ان کا سراغ مل جائے گا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں اس سرائے کی بجائے میرے پاس ٹھہریں۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن اب میرے یہاں ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں انشاءاللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح دلی سے روانہ ہوتے وقت معظم علی نے لال قلعے کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کی: "مولائے کریم! میری قوم کی بے بسی تیری رحمت کو پکار رہی ہے۔ ہمیں ان افراد کی بداعمالیوں کی سزا نہ دے جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری عزت و آزادی کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ لال قلعہ کی دیواریں اس رجل عظیم کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ جو ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں سے لڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔ یہ مایوسی اور بے بسی ہماری میراث ہے اور آج ہمیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے

جو وقت کی آندھیوں اور طوفانوں سے لڑ سکتا ہو۔ ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور ہمیں روشنی کے ایک مینار کی ضرورت ہے۔"

○

دو دن پیدل سفر کرنے کے بعد معظم علی دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا اور چوتھے روز یہ لوگ حیدرآباد دکن کا رخ کر رہے تھے۔ کوئی چھ منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہ آدمیوں کے اس قافلے کے ساتھ چھ سوار اور شامل ہو گئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ ہم دلی چھوڑ کر نظام کی فوج میں ملازمت حاصل کرنے کے ارادے سے دکن جا رہے ہیں۔ راستے کی بستیوں سے معظم علی کو یہ اطلاع ملی کہ قریباً اڑھائی سو مسافروں کا ایک قافلہ ایک ہفتہ قبل اس راستے سے گزرا ہے۔ راستے میں معظم علی کے نئے ساتھی اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ اکبر خاں انھیں مرعوب کرنے کے لیے یہ بتا چکا تھا کہ معظم علی بنگال کی فوج کا ایک بہت بڑا افسر رہ چکا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی ایک دوپہر ایک پہاڑی ندی کے کنارے سستانے کے لیے رکے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ درختوں کی چھاؤں میں آرام کرنے کے بعد وہ کوچ کی تیاری کر رہے تھے کہ انھیں سامنے پہاڑی کے عقب سے کہیں دور بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے۔ وہ جلدی سے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ پہاڑی کی چوٹی سے تھوڑی دور ادھر معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو رکنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ اب اسے بندوقوں کی آواز کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اسے ایک تنگ وادی دکھائی دی۔ وادی کے دائیں طرف ایک پہاڑی کے دامن میں قریباً اڑھائی سو آدمیوں کا ایک قافلہ مرہٹوں کے گھیرے میں آ چکا تھا۔ قافلے کے محافظ اور حملہ آور پتھروں اور درختوں کی آڑ سے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔ معظم علی نے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

زمین پر لیٹ کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی لیکن قافلے کی طرف سے لڑنے والے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ معظم علی مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔" اس پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک قافلہ گھرا ہوا ہے، تم میں سے دو آدمی گھوڑوں کے پاس رہیں۔ اکبر خاں تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے رہو۔ میں باقی آدمیوں کے ساتھ دائیں طرف سے چکر کاٹ کر دوسری پہاڑی پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بلندی سے ہماری گولیاں حملہ آوروں کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے بدحواسی کی حالت میں پیچھے ہٹیں گے لیکن تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اس پہاڑی کی طرف نہ آ سکیں۔ تمھاری گولیوں سے پریشان ہو کر اگر وہ وادی کی بائیں طرف پسپا ہونے کی کوشش کریں تو سمجھ لینا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اگر تم نے انھیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہماری تعداد بہت کم ہے تو ممکن ہے کہ وہ چند منٹ کے اندر اندر پسپا ہو جائیں اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ کے بعد قافلے کے ساٹھ آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہو چکے تھے اور مرہٹے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ان کے عقب میں پہاڑی کی چوٹی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور سات آدمی گر پڑے۔ مرہٹے بدحواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر دوسری پہاڑی کے دامن سے اکبر خاں اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلائیں اور چھ آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ مرہٹے اپنے دونوں طرف پہاڑیوں کو خطرناک سمجھ کر وادی کے درمیان سمٹنے لگے۔ قافلے کے محافظ حیران ہو کر اپنے دائیں اور بائیں دونوں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بلند آواز میں چلایا۔" تم کیا دیکھ رہے ہو، اب حملے کا وقت ہے۔ دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ قافلے کے محافظوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور دشمن پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پھر چند آدمیوں نے

بندوقیں پھینک کر تلواریں نکال لیں اور ان کا پیچھا کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر میدان خالی ہو چکا تھا اور مرہٹے وادی کے نشیب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کو گھوڑے لانے کا حکم دے کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا۔ قافلے کے محافظ اب اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ معظم علی کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد قافلے کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر سرخ و سفید رنگ کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک پتھر کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔" تھوڑی دیر پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ خدا اگر ہمیں ان ظالموں سے بچانا چاہتا ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج سکتا ہے، اگر آپ فرشتے نہیں تو میں آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہوں۔ میرا نام فخر الدین ہے اور میں اس قافلے کے ساتھ حیدر آباد جا رہا تھا۔"

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔" میرا نام معظم علی ہے اور یہ میرے دوست اکبر خاں ہیں اور ہماری منزل بھی حیدر آباد ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم وقت پر نہ پہنچ سکے ورنہ اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔"

فخر الدین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔" تم شہیدوں کی قبریں کھودنے کا انتظام کرو اور زخمیوں کو ایک جگہ جمع کرو۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔" آپ کے باقی آدمی کہاں ہیں؟"

" وہ اس پہاڑی کے پیچھے اپنے گھوڑے لینے گئے ہیں۔"

قافلے کی عورتیں اور بچے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے، دو لڑکیاں جھاڑیوں سے باہر نکلیں اور بھاگتی ہوئی فخر الدین کی طرف بڑھیں۔ بڑی لڑکی جس کے ہاتھ میں بندوق تھی فخر الدین کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گئی اور دوسری جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی " ماموں جان!

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ماموں جان !! کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار فخرالدین کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ معظم علی نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ بدحواس ہو کر اپنا نقاب درست کرنے لگی۔ معظم علی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کی تاہم چند ثانیے ایک حسین اور دلکش تصویر اس کی نظروں کے سامنے پھرتی رہی۔

فخرالدین نے چھوٹی لڑکی سے کہا۔ "بلقیس! بیٹی جاؤ اپنی ماں کے پاس بیٹھو اور عطیہ کو بھی تسلی دو کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ خدا نے ہمارے مدد کے لیے فرشتے بھیج دیئے ہیں۔"

"فرشتے؟" بلقیس نے حیران سی ہو کر کہا۔ "فرشتے کہاں ہیں؟"

فخرالدین نے مسکرا کر معظم علی اور اکبر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ فرشتے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

بلقیس نے حیرانی اور تشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں اکبر خاں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اکبر خاں اسے سچ مچ ایک فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی بہن کی طرف بڑھی اور فخرالدین نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ان کا باپ فوت ہو چکا ہے اور میں انہیں دلی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان دنوں دلی میں داخل ہونا معمولی بات نہیں لیکن خوش قسمتی سے پونا کے ایک ہندو تاجر کے ساتھ میرے کاروباری تعلقات تھے اور اس نے مرہٹہ حکومت سے میرے لیے پروانۂ راہداری حاصل کر کے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ دلی سے واپسی پر راستے میں ہمیں یہ قافلہ مل گیا۔ یہ لوگ شمال کے شہروں سے تلاش روزگار کے لیے حیدرآباد جا رہے تھے۔ چلیے زخمیوں کو دیکھیں۔"

معظم علی شام سے پہلے ایک منزل اور طے کرنا چاہتا تھا لیکن قافلے کی حفاظت کے خیال سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

○

رات قدرے خنک تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد قافلے کے پڑاؤ میں جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے گرد جمع تھے۔ چند مسلح آدمی پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں ایک چھوٹے سے خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور خیمے سے چند قدم دور فخرالدین، معظم علی، اکبر خاں اور چند اور آدمی ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے کہا۔ "حیدرآباد پہنچ کر ان یتیموں اور بیواؤں کا کیا بنے گا جن کے سرپرست لڑائی میں مارے جا چکے ہیں؟ ہم سب کو مل کر ان کا بوجھ اٹھانا چاہیئے!"

فخرالدین نے کہا۔ "آپ میں سے کسی کو ان کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ حیدرآباد میں ان کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوگی۔"

فخرالدین سے چند سوالات پوچھنے پر معظم علی کو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تاجروں کے ایک بااثر اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور چند سال قبل دلی سے ہجرت کر کے حیدرآباد دکن میں آباد ہو چکا ہے اور اس کا تجارتی کاروبار دکن سے میسور اور کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے۔

جب معظم علی نے فخرالدین کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگذشت بیان کی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کے عزیز حیدرآباد میں ہیں تو میں وہاں پہنچتے ہی ان کا پتہ کر دوں گا۔ حیدرآباد میں آپ میرے مہمان ہوں گے۔"

تھوڑی دیر بعد چند آدمی اٹھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس چلے گئے اور باقی وہیں الاؤ کے قریب سو گئے۔ فخرالدین دیر تک معظم علی سے باتیں کرتا رہا۔ بیت بنگال کے حالات زیر بحث آنے اور معظم علی نے میر جعفر کی کٹھ پتلی حکومت کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس کے بعد اودھ، روہیلکھنڈ اور دلی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر دکن کا ذکر آیا اور فخرالدین نے کہا "دکن ان دنوں شمال اور مشرق سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ دلی کی قدیم شان و شوکت اب آپ کو حیدرآباد میں دکھائی دے گی لیکن میں دکن کے مستقبل کے متعلق زیادہ پرامید نہیں۔ کرناٹک کی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اثر و رسوخ اب دکن کے دربار میں بھی پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف مرہٹے بڑی تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور وہ صرف دکن پر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بیرونی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے دکن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد گذشتہ چند سال میں اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کے اس عظیم دفاعی حصار کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ دکن کی محلاتی سازشوں کا بالآخر نتیجہ کیا ہوگا لیکن میں جس شخص کی کامیابی سے ڈرتا ہوں وہ میر نظام علی ہے۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ لڑایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جس دن دکن کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی وہ قوم کے لیے بنگال کے میر جعفر اور کرناٹک کے محمد علی والاجاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ انگریزوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں جنوب کے مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ اگر میرے اندازے غلط نہیں تو ہم بہت جلد گیدڑوں اور بھیڑیوں کی شکارگاہوں میں ایک شیر کی گرج سنیں گے۔ میں ایک ایسے آدمی سے مل چکا ہوں جو ایک بیدار مغز سیاستدان بھی ہے اور ایک اولوالعزم سپاہی بھی!"

اکبر خاں، جو معظم علی کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اچانک چونک اٹھا "جی وہ کون ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے لیکن اگر وہ چند برس زندہ رہا اور قدرت نے اس کی مدد کی تو وہ جنوب کے مسلمانوں کا آخری محافظ ثابت ہوگا۔ اس کا نام حیدر علی ہے اور اس وقت وہ میسور کی فوج کا ایک افسر ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب انگریز اور مرہٹے اسے اپنا ایک طاقت ور اور خطرناک حریف سمجھیں گے۔ ابھی جب آپ مجھے بنگال میں اپنی سپاہیانہ زندگی کے واقعات سنا رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی دن آپ کی آخری منزل میسور ہوگی۔ میں اس سے دو بارہ مل چکا ہوں اور یقین کیجیے کہ میں اپنی زندگی میں کسی اور شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ آپ کی طرح وہ ان طالع آزماؤں کو ملک کا بدترین سمجھتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ اپنا سیاسی مستقبل وابستہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر اس کے عزائم اس قدر بلند ہیں تو ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ خدا اسے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو اپنے ہر محسن کا سر کاٹ کر دشمن کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

پاس ہی خیمے کے اندر عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں دن بھر کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ عطیہ نے کہا۔ "امی جان! ماموں جان ساری رات باہر بیٹھے رہیں گے؟"

"وہ آجائیں گے بیٹی۔ تم اب سو جاؤ!"

بلقیس نے ذرا آگے سرک کر عطیہ کے کان میں کہا۔ "آپا جان آپ نے فرشتے دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔ لیکن تمھیں اس وقت بیٹھے بیٹھے فرشتوں کا خیال کیسے آیا؟"

"اس لیے کہ میں نے آج فرشتے دیکھے ہیں ــــ دو فرشتے ــــ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور اس وقت وہ ماموں جان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں ــــ دیکھیے اُدھر!" یہ کہتے ہوئے بلقیس نے خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھا دیا۔

ماں نے کہا۔ "پگلی اب آرام سے سو جاؤ۔ انھوں نے ہماری جان بچائی ہے اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

تم ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔"

"میں مذاق نہیں کرتی امی جان! ماموں جان کہتے تھے وہ فرشتے ہیں۔"

"انھوں نے بالکل درست کہا۔ اگر یہ لوگ خدا کی رحمت کے فرشتے بن کر نہ آتے تو اس وقت ہماری لاشیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔"

○

اگلی صبح یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ کوئی چار کوس چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ چند زخمی گھوڑوں پر سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ فخرالدین کی درخواست پر گاؤں کے زمیندار نے معقول کرائے پر سات بیل گاڑیاں مہیا کر دیں۔ زخمیوں کے علاوہ قافلے کی چند عورتیں اور بچے جو گھوڑوں پر طویل سفر کرنے سے تنگ آ چکے تھے بیل گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ایک گاڑی میں فخرالدین کی بہن اور بھانجیاں بیٹھ گئیں۔

گاؤں کے لوگوں سے استفسار پر معظم علی کو یہ معلوم ہوا کہ مرہٹہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں یہ لوگ کہیں باہر سے آئے ہیں اور دو دن قبل اس گاؤں سے دس کوس شمال کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کو لوٹ چکے ہیں۔

اگلے منزل پر ایک زخمی نے جس کی حالت بہت نازک تھی دم توڑ دیا۔ اس کے دو دن بعد ایک اور زخمی چل بسا۔

حیدرآباد پہنچتے پہنچتے معظم علی قافلے کے ہر بچے اور بوڑھے کی نگاہ میں ایک ہیرو بن چکا تھا۔ مسلح آدمی اسے اپنا کمانڈر تصور کرتے تھے۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے وہ ایک سعادت مند بیٹا اور نوجوانوں اور کمسن بچوں کے لیے وہ ایک شفیق بھائی بن چکا تھا۔ بلقیس کبھی کبھی گاڑی کا پردہ سرکا کر اکبر کی طرف دیکھتی اور عطیہ کے کان میں کہتی "اباجان وہ یقیناً کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔" کبھی کبھی وہ پیدل چلنے کے بہانے گاڑی سے کود پڑتی اور پھر تھوڑی دور بھاگنے کے بعد فخرالدین سے کہتی "ماموں جان

میں گھوڑے پر سواری کروں گی" اور فخرالدین کے نوکر اسے گھوڑے پر سوار کرا دیتے۔ پھر وہ اکبر خاں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتی۔ "حیدرآباد ابھی یہاں سے کتنی دور ہے؟ آپ نے ہمایوں کا مزار دیکھا ہے؟ لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھی ہے؟ ماموں جان کہتے تھے کہ آپ شیر کا شکار کھیلا کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے ہاتھی بھی مارا ہے؟"

ایک دن اس نے بڑے بھولے پن سے کہا "بھلا یہ درست ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟"

اکبر خاں اس سوال پر ہنس پڑا اور بلقیس کا معصوم چہرہ حیا سے تمتما اٹھا۔

"کیا بات ہے اکبر؟" معظم علی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ پوچھتی ہے میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں"

معظم علی نے کہا۔ "اس میں اس کا قصور نہیں۔ آجکل دلی کا ہر تیسرا آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

بلقیس کو اکبر خاں کی ہنسی اور اس سے زیادہ معظم علی کی مداخلت پسند نہ آئی اور اس نے مڑ کر ایک نوکر کو آواز دی۔ "یہ گھوڑا سنبھالو میں گاڑی پر جاتی ہوں۔"

جب وہ گھوڑے سے اتر کر گاڑی پر سوار ہو رہی تھی تو عطیہ نے بگڑ کر کہا "بس گھوڑے کی سواری کا شوق پورا ہو گیا؟"

بلقیس کچھ دیر منہ بسور کر بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے کہا "آپا جان وہ دونوں گنوار ہیں!"

عطیہ ہنس پڑی لیکن ماں نے ڈانٹ کر کہا "بڑی بدزبان ہو تم!"

تھوڑی دیر بعد عطیہ نے اس کے کان میں کہا "چڑیل سچ بتاؤ کیا کہا تھا تم نے اس سے؟"

"میں نے اسے کیا کہا تھا!"

"اچھا تمھارے بادشاہ سلامت کو بلا کر یہ کہوں کہ ملکۂ عالیہ خفا ہو کر بیل گاڑی پر

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

سوار ہو گئی ہیں۔"

"امی جان!" بلقیس نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔ "آپا جان مجھے گالیاں دیتی ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "عطیہ چھوڑو اسے تنگ نہ کرو۔"

O

حیدر آباد پہنچ کر معظم علی نے فخرالدین کی جو شان و شوکت دیکھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ دو منزلہ رہائشی مکان کے ساتھ اس کا مہمان خانہ اس قدر وسیع تھا کہ وہاں بیک وقت سو مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ مہمان خانے کے ساتھ اس کا وسیع دفتر تھا جہاں آٹھ دس منشی کام کرتے تھے۔ وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ اسلحہ، بارود، ریشم، صندل اور گرم مسالے کی تجارت کرتا تھا۔ گلی کی دوسری طرف ایک وسیع حویلی میں اصطبل اور گودام تھے۔ جب یہ قافلہ حیدر آباد پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ فخرالدین کا ایک نوکر چند گھنٹے پہلے گھر پہنچ کر اس کی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ اس کے نوکر مہمان خانے کی نچلی منزل میں قافلے کے لاوارث بچوں، عورتوں اور بے سہارا آدمیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر چکے تھے۔ معظم علی اور اکبر خاں کو بالائی منزل میں جگہ دی گئی اور ان کے نوکر فخرالدین کے نوکروں کے ساتھ دوسری حویلی میں چلے گئے۔ قافلے کے باقی لوگ حیدر آباد میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو رخصت ہو چکے تھے۔

رات کے وقت اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد فخرالدین نے معظم علی سے کہا۔ "اب آپ آرام سے سو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی الصباح آپ میرے علاوہ جس دوسرے آدمی کو پہلے دیکھیں گے، وہ مرزا حسین بیگ کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔"

معظم علی نے کہا۔ "لیکن حیدر آباد بہت بڑا شہر ہے۔ آپ اتنی جلدی کیسے پتہ لگا لیں گے؟"

فخرالدین نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میرے پاس ڈیڑھ سو نوکر ہیں۔ اس

کے علاوہ میں ابھی شہر کے کوتوال اور فوج کے چیدہ چیدہ افسروں کے پاس جاتا ہوں۔ اگر مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار حیدر آباد میں ہیں تو انھیں تلاش کرنے کے لیے ایک رات کافی ہے۔"

تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود معظم علی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ پھر صبح جب اس کی نیند کھلی تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ کمرے میں دوسرے بستر پر اکبر خاں ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ فخرالدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار مل گئے ہیں وہ صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے بھی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ خیال کیا۔ اب چلیے وہ نیچے بیٹھک میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میری نیند اس قدر اہم نہ تھی۔" معظم علی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "انھوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟"

فخرالدین نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "انھیں مرزا حسین بیگ کے بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

معظم علی ایک ثانیے کے لیے لٹے ہوئے مسافر کی طرح فخرالدین کی طرف دیکھتا رہا۔

"مجھے افسوس ہے۔" فخرالدین نے کہا۔ "چلیے!"

معظم علی، فخرالدین کے ساتھ نیچے اتر کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ تین عمر رسیدہ آدمی اور پانچ نوجوان قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ معظم علی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ مرزا حسین بیگ کے بچے حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے۔ مرشد آباد چھوڑنے کے بعد وہ لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں لکھنؤ پہنچا تو وہاں سے ان کے رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے۔ مرزا صاحب کے متعلق مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

فیض آباد، آگرہ اور دلی کے علاوہ کئی اور شہروں میں انھیں تلاش کرچکا ہوں۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ "لکھنؤ میں ان کا رشتہ دار میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں مرزا صاحب کا ماموں زاد بھائی ہوں لیکن بدقسمتی سے میں پلاسی کی جنگ سے پہلے لکھنؤ چھوڑ کر یہاں آچکا تھا۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "آپ ارشد بیگ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ میں سے عبدالکریم کون ہیں؟"

دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ "میں ہوں لیکن مجھے بھی مرزا حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں آتے اور ہمیں نہ ملتے۔"

تیسرے آدمی نے معظم علی سے سوال کیا۔ "آپ محمود علی خاں کے بیٹے ہیں؟"

"جی ہاں۔" معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

اس نے کہا۔ "میں شوکت بیگ کا باپ ہوں۔"

معظم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

"مجھے پلاسی کی جنگ سے چند ہفتے بعد ملک بدر کردیا گیا تھا۔ میں نے بنگال چھوڑتے وقت مرشدآباد میں مرزا حسین بیگ کا پتہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں جاکر بھی میں نے انھیں تلاش کیا تھا۔"

معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ڈھاکہ جاکر ان کا پتہ کروں گا۔"

○

مرزا حسین بیگ کے رشتہ داروں سے ملنے کے بعد معظم علی کی حالت اس مسافر کی

سی تھی جس کے سامنے کوئی منزل یا راستہ نہ ہو۔ اسے حیدرآباد کی پررونق گلیاں اور بازار سنسان نظر آتے تھے۔ فخرالدین، مرزا حسین بیگ کی بیوی اور صاحبزادی کا پتہ دینے والے کو پانچ سو اشرفیاں انعام دینے کا اعلان کرچکا تھا اور شہر میں منادی کرنے والے گلی گلی گھوم رہے تھے لیکن فرحت اور اس کی ماں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اکبر خاں کے لیے حیدرآباد کا پررونق شہر ایک بہت بڑا عجائب گھر تھا، وہ صبح سویرے اٹھتا اور کسی نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ اسے حیدرآباد کی فوجی تربیت گاہ میں نوجوان افسروں کی نیزہ بازی، شہسواری اور چوگان کے کھیل بہت پسند تھے۔ کبھی وہ فخرالدین کے اصطبل میں جاتا اور کسی شوخ اور تند گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کے لیے چلا جاتا۔ اسے معظم علی کے رنج و کرب کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن معظم علی کے ساتھ بیکار بیٹھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یہ کہتا۔ "بھائی جان! آج فلاں جگہ نیزہ بازی ہو رہی ہے۔ آج فلاں میدان میں فوج کے افسر چوگان کھیل رہے ہیں۔ آج فخرالدین کے اصطبل میں چند نئے گھوڑے آئے ہیں، چلیے آپ کو دکھاتا ہوں!"

معظم علی کبھی کبھی دل پر جبر کرکے اس کا ساتھ دیتا لیکن عام طور پر اس کا یہی جواب ہوتا۔ "اکبر تم جاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

○

ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اکبر خاں کہیں باہر گیا ہوا تھا اور معظم علی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے سامنے طویل برآمدے کا ایک سرا رہائشی مکان سے ملا ہوا تھا۔ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور معظم علی کمرے سے ایک کرسی نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھلا اور بلقیس جھجکتی شرماتی ہوئی آگے بڑھی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"آؤ بلقیس!" معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر پیار سے کہا۔ "میں نے تمھیں کل سے نہیں دیکھا۔ کہاں غائب تھیں تم؟"

بلقیس نے جواب دیا۔ "کل آپا جان کو بخار تھا اور میں ان کے پاس تھی۔"

"اب کیسی ہیں وہ؟"

"اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ امی جان پوچھتی ہیں، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ماموں جان کہتے تھے کہ آپ یہاں سے بہت جلد چلے جائیں گے؟"

"ہاں! میرا ارادہ ہے کہ میں اگلے ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

"نہیں آپ نہ جائیں!" بلقیس نے منہ بسور کر کہا۔ "اگر آپ یہاں ٹھہریں تو آپ کے رشتہ دار ضرور مل جائیں گے۔ میں ہر روز یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ کے رشتہ دار آپ کو مل جائیں۔ امی جان اور آپا جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کرتی ہیں اور میں یہ بھی دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "بلقیس تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میرے لیے حیدرآباد ٹھہرنے کی دعا نہ کیا کرو۔"

"کیوں آپ کو حیدرآباد پسند نہیں؟"

"حیدرآباد بہت اچھا شہر ہے لیکن میں یہاں ایک مسافر ہوں۔"

بلقیس نے مایوس ہو کر کہا۔ "آپ کو گھر یاد آتا ہوگا؟"

"میرا کوئی گھر نہیں۔" معظم علی نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں رہتے؟"

"میں لکھنؤ جانا چاہتا ہوں۔"

"لکھنؤ میں آپ کے رشتہ دار ہوں گے؟" بلقیس نے کہا۔

"نہیں۔"

بلقیس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ماموں جان آگئے!"

معظم علی نے صحن کی طرف دیکھا۔ فخرالدین ایک چھتری اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معظم علی اٹھ کر کمرے سے دوسری کرسی نکال لایا۔ فخرالدین اوپر پہنچا تو بلقیس وہاں سے چلی گئی۔

فخرالدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "اکبر خاں کہاں ہے؟"

"جی وہ بارش سے تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے اصطبل میں گھوڑے دیکھ رہا ہوگا۔"

"اسے گھوڑوں کا بہت شوق ہے، میں اسے عربی نسل کا ایک بہترین جوڑا دینا چاہتا ہوں۔ بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ اگر آپ اسے میرے پاس چھوڑ دیں تو میں اسے چند برس میں ایک کامیاب تاجر بنا سکتا ہوں۔ اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق بھی ہے۔"

"یہ شوق اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔"

فخرالدین نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

فخرالدین نے تھوڑی دیر گردن جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں حیدرآباد میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ آپ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنھیں قدرت نے پہاڑوں کے سینے چیرنے کی ہمت عطا کی ہے۔ زندگی سے آپ کی یہ بیزاری بڑی افسوسناک ہے۔ میں ابھی سپہ سالار سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے آپ کی سرگزشت

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

سننے کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر ایسا نوجوان حیدرآباد کی فوج میں شامل ہونا پسند کرے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ آپ کو بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کا مستقبل بہت روشن ہوگا اور آپ اپنی اداس اور مغموم زندگی میں نئی دلچسپیاں تلاش کر سکیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں لیکن یہ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں آئندہ فوج کی ملازمت نہیں کروں گا۔ میرے لیے اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے مقصد قربانیوں کی یاد کافی ہے جن کا خون بنگال کی خاک میں جذب ہو چکا ہے۔"

فخرالدین نے پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے اور شاید آپ کو بھی عجیب معلوم ہو لیکن ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قدیم رسم و رواج کی دیواریں توڑ رہا ہے۔ میری اور مجھ سے زیادہ میری ہمشیرہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ کو ان کی بڑی لڑکی کا شریکِ حیات بنا دیا جائے اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ نے ہماری جانیں بچائی ہیں بلکہ اس لیے کہ میں اپنی یتیم بھانجی کے لیے آپ جیسا نیک اور قابلِ اعتماد رفیقِ حیات تلاش کر لینا قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں اور اپنی بھانجی کے متعلق اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک نیک ماں اور شریف باپ کی بیٹی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ میں اس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹا سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ آپ جیسے سلیم الفطرت انسان کے ساتھ ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے گی۔"

معظم علی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فخرالدین کی طرف دیکھا اور آبدیدہ ہو کر کہا: "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے روئے زمین کے تمام پہاڑ اٹھا کر

میری گردن پر رکھ دیئے ہیں۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ آپ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ دنیا آج بھی فرشتوں کے وجود سے خالی نہیں لیکن میں اس مسئلے میں بے بس ہوں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زبان سے انتہائی دیانت دارانہ جواب بھی شرافت اور انسانیت کا منہ نوچنے کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں:- یہ چند برس کی بات ہے۔ میرا ایک دوست جو مجھے بھائی کی طرح عزیز تھا، لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر دم توڑ رہا تھا۔ اس دنیا میں اسے اپنی ایک بہن سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں اس کے مستقبل کا امین بنوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے بھائی کی آخری خواہش پوری ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد میں گرفتار اور پھر مرہٹوں کی قید سے نکل کر گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہو چکی تھی، پھر ایک دن ایسا ہوا جب میں اور اس لڑکی کا منگیتر ایک ہی محاذ پر مرہٹوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن چکے تھے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اس کے ہونے والے شوہر کے لیے اپنے دل میں ایک بھائی کی شفقت محسوس کرتا تھا۔ یہ نوجوان ایک لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ہمارے والدین ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ہی تھے کہ بنگال میں انقلاب آ گیا۔"

فخرالدین نے متاثر ہو کر کہا: "اور وہ لڑکی مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد فخرالدین اٹھ کر زنانخانے میں چلا گیا اور معظم علی دیر تک وہیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

بیٹھا رہا۔ معظم علی نے عطیہ کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا۔ تاہم اس کی معمولی جھلک بھی کسی نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن معظم علی کے پہلو میں وہ دل نہ تھا۔ عطیہ بہت کچھ تھی لیکن وہ فرحت نہ تھی۔

"فرحت! فرحت!!" وہ اپنے تصور میں اسے آوازیں دیتا ہوا اٹھا اور کمرے کے اندر جا کر بستر پر گر پڑا۔ "فرحت! فرحت!! تم کہاں ہو؟ کاش میری آواز تمھارے کانوں تک پہنچ سکتی!"

اگلے روز رات کے وقت معظم علی اور اکبر خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، فخر الدین اندر داخل ہوا اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "معظم علی! حیدر آباد کی فوج میں ملازمت کے متعلق تم میری تجویز رد کر چکے ہو لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمھیں بیکار بیٹھ کر چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر تم تجارت شروع کرنا چاہو تو میں تمھیں اور اکبر خاں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو میں تمھیں بڑی خوشی سے قرضِ حسنہ کے طور پر ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم جب چاہو مجھے واپس کر دینا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی کام میں تمھارا جی لگ جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "تجارت کے متعلق میں بھی چند دنوں سے سوچ رہا ہوں ممکن ہے کہ میں یہیں سے ابتدا کر دوں اور لکھنؤ جاتے ہوئے اپنے ساتھ چند گھوڑے لیتا جاؤں اور سرمائے کے لیے میں آپ کو تکلیف دینا پسند نہیں کروں گا۔"

"لیکن سرمائے کے بغیر تو تجارت نہیں ہوتی!"

"سرمایہ میرے پاس کافی ہے۔" معظم علی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کمرے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی نکالی اور اس میں سے ایک ہیرا نکال کر فخر الدین کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "آپ کے خیال میں اس کی قیمت کیا ہوگی؟"

فخر الدین نے چراغ کی روشنی میں ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا: "اگر آپ کے پاس

اس قسم کے آٹھ دس اور ہیرے ہوں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھنؤ کے امیر ترین آدمی ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اس تھیلی میں تیس ہیرے اور ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی پہچان نہیں۔ میں نے ایک ہیرا جو اس سے ذرا چھوٹا تھا، لکھنؤ میں بارہ سو اشرفی کے عوض بیچا تھا اور اس ہیرے کو فروخت کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"لکھنؤ میں آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ہیرے کے عوض میں آپ کو پانچ گنا زیادہ دلا سکوں گا۔"

معظم علی نے اس کے ہاتھ میں تھیلی دیتے ہوئے کہا: "انھیں بھی دیکھ لیجیے!"

فخر الدین نے تھیلی اپنی ہتھیلی پر الٹنے کے بعد کہا: "یہ ہیرے بہت قیمتی ہیں لیکن آپ نے لیے کہاں سے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "یہ ابّا جان کو سراج الدولہ کا آخری انعام تھا۔"

فخر الدین نے کہا: "اب مجھے مہمان خانے پر پہرا لگانا پڑے گا۔ آپ نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔"

"آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

بارھواں باب

ایک صبح صابر، شیر علی کے لیے ناشتا تیار کر رہا تھا کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی نے آواز دی۔ "صابر، صابر دروازہ کھولو!"

صابر نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے دلاور خاں گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ صابر نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ "معظم علی خاں کہاں ہیں؟"

"وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔" دلاور خاں نے صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"صابر! کون ہے؟" مکان کے ایک کمرے سے شیر علی کی آواز سنائی دی۔

"جی دلاور خاں آگیا ہے۔"

شیر علی جلدی سے باہر نکل آیا۔ صابر دلاور خاں سے کئی سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ دے کر جلدی سے آگے بڑھا اور شیر علی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جناب خاں صاحب آرہے ہیں۔ مجھے انھوں نے یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنے ساتھ اسّی گھوڑے لا رہے ہیں۔ اس لیے آپ شہر سے باہر فوراً کوئی ایسا مکان کرائے پر حاصل کریں جہاں گھوڑوں کے علاوہ پندرہ بیس آدمیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکے۔ خاں صاحب نے کہا ہے کہ اگر شہر کے باہر کوئی ایسی کشادہ حویلی مل جائے جس کے اندر ایک رہائشی مکان بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اگر کرائے کی بجائے قیمت پر کوئی موزوں جگہ ملتی ہو تو خرید لیں وہ آتے ہی قیمت ادا کر دیں گے۔ وہ یہ

کہتے تھے کہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے ہمیں لکھنؤ میں مستقل طور پر ایک نہایت کشادہ مکان کی ضرورت ہے۔"

شیر علی نے دلاور خاں سے چند سوالات پوچھے اور ناشتے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

دن کے تیسرے پہر شیر علی، دلاور خاں کے ساتھ شہر کے مغربی دروازے پر کھڑا معظم علی کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر کی نماز کے تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک قافلے کی جھلک دکھائی دی اور دلاور خاں نے کہا۔ "جناب! وہ آگئے!"

تھوڑی دیر بعد قافلہ کچھ فاصلے پر سڑک سے اتر کر ایک کھیت میں رک گیا اور شیر علی اور دلاور خاں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

معظم علی، شیر علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اکبر خان نے اس کی تقلید کی۔

شیر علی نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ان کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا اور کہا۔ "آپ کو یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ شہر کی دوسری طرف مضافات کی ایک بستی میں مجھے ایک بہت کھلی حویلی مل گئی ہے۔ حویلی کا مالک نہایت شریف آدمی ہے اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھوڑے اور نوکر یہاں رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے میں کوئی کرایہ وصول نہیں کروں گا۔ اس کے بعد اگر مجھے مناسب قیمت مل گئی تو میں حویلی آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔ حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان بھی ہے جو بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چند پرانی کوٹھڑیاں ہیں جو نوکروں کے کام آسکتی ہیں۔ گھوڑے ابھی ہمیں کھلے صحن میں باندھنے پڑیں گے۔ اگر حویلی کے مالک کے ساتھ ہمارا سودا ہو گیا تو گھوڑوں کے اصطبل تعمیر کرنے کے لیے اس میں کافی جگہ ہے۔"

معظم علی نے سوال کیا۔ "آپ نے اس سے قیمت کے متعلق پوچھا ہے؟"

"جی ہاں میں نے پوچھا تھا لیکن وہ براہِ راست آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

وہ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے شہر کی دوسری طرف ایک بستی میں داخل ہوئے، حویلی کا مالک دروازے پر کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کے ساتھ اس کا تعارف کرایا تو معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ اگر آپ اس قدر فیاضی سے کام نہ لیتے تو ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔"

حویلی کے مالک نے کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ جگہ کسی کام آ رہی ہے، یہ حویلی ایک سرائے تھی۔ پہلے یہاں کافی رونق رہا کرتی تھی لیکن اب شہر میں چند نئی سرائیں بن گئی ہیں اور مسافر یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلے سال جب میں نے اسے خریدا تھا تو یہ نہایت شکستہ حالت میں تھی۔ میں اسے مرمت کروا چکا ہوں۔ اس کے اندر کام کا صرف ایک مکان تھا اور اس پر میں نے بالاخانہ تعمیر کرایا ہے۔ تین چار مہینے میں نے سرائے کا کاروبار چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کبھی باہر سے کوئی بڑا قافلہ آتا تھا تو لوگ مجبوری کی حالت میں ایک آدھ دن کے لیے یہاں اتر پڑتے تھے لیکن اس کے بعد وہ شہر میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے سرائے کا کاروبار بند کر دیا۔ آپ کے کاروبار کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہوگی اور اگر آپ خریدنا چاہیں تو میں کوئی نفع لیے بغیر فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اندر باہر سے اچھی طرح دیکھ لیں!

"چلیے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" معظم علی سرائے کے مالک کے ساتھ اندر داخل ہوا اور صحن میں کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بولا: "یہ جگہ ہمارے کام آ سکتی ہے۔ آپ قیمت بتائیں!"

"نہیں آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔ آئیے میں آپ کو وہ مکان دکھاتا ہوں۔"

مالک مکان کے اصرار پر معظم علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ نچلی منزل کے پانچ کمرے دکھانے کے بعد وہ اسے بالاخانے پر لے گیا۔ وہاں تین کشادہ کمروں کے سامنے ایک برآمدہ

تھا اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت ایک چھوٹے سے صحن کا کام دیتی تھی۔

معظم علی نے بالاخانے سے حویلی کا جائزہ لینے کے بعد مالک مکان سے کہا۔ "آپ سودے کی بات کریں!"

مالک مکان نے کہا۔ "لیکن جناب اس طرف دیوار کے ساتھ چند کوٹھڑیاں ہیں نیچے اتر کر آپ وہ بھی دیکھ لیں۔"

"انھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس حویلی کا بہت سا حصہ دوبارہ تعمیر کرنا پڑے گا۔ آپ بلا جھجک قیمت بتائیں!"

مالک مکان نے جواب دیا۔ "جناب میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ میں نے سات ہزار میں یہ حویلی خریدی تھی اور قریباً اڑھائی ہزار روپیہ اس پر اور خرچ کر چکا ہوں۔ حویلی کا سودا چند آدمیوں کے سامنے ہوا تھا۔ صبح تک میں انھیں بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دینے کے لیے تیار ہوں پانچ سو آپ کا نفع ہوگا۔"

"میں اس پانچ سو کو نفع کی بجائے ایک امیر آدمی کا انعام سمجھوں گا۔ مجھے دس ہزار منظور ہے لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے یہ حویلی خریدی تھی تو یہاں دو غریب عورتیں رہتی تھیں۔ سرائے کے پہلے مالک نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انھیں یہیں رہنے دوں، وہ بے سہارا ہیں اور گاؤں کے لوگوں کے کپڑے سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ کبھی کبھی میری بیوی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی یہاں مسافر آیا کرتے تھے تو انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور وہ سارا دن اپنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے کونے کی ایک کوٹھڑی کے سامنے ان کے پردے کے لیے ایک چھوٹی سی دیوار بنوا دی ہے۔ وہ نہایت نیک ہیں اور آپ جیسے خدا ترس لوگوں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی اعانت کی مستحق ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ انھیں وہاں رہنے دیں۔"

معظم علی نے اپنی جیب سے چاندی اور سونے کے چند سکے نکال کر حویلی کے مالک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "انھیں ہماری طرف سے پیش کر دیں اور صبح یہاں تشریف لاکر اپنی رقم وصول کرلیں۔"

اس کے بعد معظم علی، شیر علی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب گھوڑوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کے قیام و طعام کا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔ میں اکبر خاں کے ساتھ شہر کے مکان میں جاتا ہوں۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل ہم یہاں آجائیں گے۔"

○

اگلے دن معظم علی شہر کے مکان سے اپنا مختصر سا سامان اس حویلی میں منتقل کر چکا تھا۔

بالائی منزل کے کمرے وہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر چکا تھا۔ شیر علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر سجا رہا تھا۔ شہر سے گھوڑوں کے خریدار جوق در جوق وہاں جمع ہو رہے تھے اور حویلی ایک اچھی خاصی منڈی معلوم ہوتی تھی۔ آس پاس کے بہت سے لوگ صرف گھوڑے دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ صابر سارا دن کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی حویلی کا ایک چکر لگاتا۔ اسے وہ سفید گھوڑے جو اکبر خاں کو فخر الدین نے دیئے تھے، بےحد پسند تھے اور اس کی پسند کی وجہ یہ تھی کہ اس نے معظم علی اور اکبر خاں کو ان کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کسی دیہاتی کو بازو سے پکڑ کر ان گھوڑوں کے پاس لے جاتا اور پوچھتا "تمھارے خیال میں ان گھوڑوں کی کیا قیمت ہوگی؟" وہ سادگی سے کوئی رقم بتاتا تو صابر جھنجھلا اٹھتا۔ "واہ کیا کہنے تمھاری پہچان کے۔ ابے اُلّو ان کی قیمت

تمھارے سارے گاؤں سے زیادہ ہے۔"

تین دن کے اندر معظم علی بیس گھوڑے فروخت کر چکا تھا۔ چوتھے روز ایک خوش پوش اجنبی اس کے پاس آیا اور اس نے تیس گھوڑے منتخب کر کے ان کی قیمت طے کرنے کے بعد کہا "میں یہ گھوڑے بنارس کے راجہ کے لیے خریدنا چاہتا ہوں لیکن گھوڑوں کو بنارس پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان کی قیمت بھی آپ کو وہیں ادا کی جائے گی۔"

معظم علی نے جواب دیا "مجھے بنارس پہنچانے میں کوئی عذر نہیں لیکن اگر راجہ نے یہ گھوڑے پسند نہ کیے تو۔۔۔؟"

"میں راجہ کا چچازاد بھائی ہوں۔" اس نے جواب میں کہا۔

"آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

"کل۔"

معظم علی، شیر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "چچا! آپ بنارس جانا پسند کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت اچھا آپ کل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

○

دو دن بعد لکھنؤ میں یہ افواہ گرم تھی کہ دتاجی سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے سہارنپور کی طرف پیشقدمی کر رہی ہیں۔ روہیلکھنڈ کے مسلمانوں کے نزدیک نجیب الدولہ ایک بہت بڑے قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکبر خاں یہ خبر سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے کر بالا خانے پر معظم علی کے کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی دریچے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اکبر

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

بیٹھ جاؤ!"

اکبر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور معظم علی نے کہا۔ "ہماری ابتدا بہت اچھی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ گھوڑے اتنی جلدی بک جائیں گے۔ میں شیخ فخر الدین کو پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہمارے لیے دو سو گھوڑے اور خرید لیں۔ ان کا جواب آنے پر مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی دلچسپی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بھائی جان! مرہٹوں کی فوج نجیب الدولہ کے تعاقب میں سہارنپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے ابھی یہ خبر سنی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"ان حالات میں تمھیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میرے ساتھی گھوڑوں پر زینیں ڈال رہے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "بہت اچھا تم نیچے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

اکبر خاں نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "بھائی جان آپ خفا تو نہیں ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر سننے کے بعد اگر تم فوراً گھر جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو مجھے یقیناً افسوس ہوتا۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا احساس اور کسے ہو سکتا ہے کہ روہیلکھنڈ کے ایک معزز قبیلے کے سردار کی حیثیت میں تمھاری ذمہ داریاں کیا ہیں اور میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہو گا کہ تمھیں میری ضرورت ہے یا میں تمھارے کسی کام آسکتا ہوں تو میں بن بلائے تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

اکبر خاں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالاخانے سے اتر کر حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو اکبر خاں

اور اس کے ساتھی گھوڑے پر زینیں ڈال چکے تھے۔ معظم علی کے ایک ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اکبر یہ لو!"

"اس میں کیا ہے؟" اکبر خاں نے سوال کیا۔

اس میں تمھارے حصے کی کچھ رقم ہے جب دوبارہ ملاقات ہو گی تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔ اس میں ساٹھ اشرفیاں تمھارے آدمیوں کے لیے ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ نوکروں کے متعلق میں آپ کو منع نہیں کرتا لیکن اپنے لیے میں ایک کوڑی قبول نہیں کروں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "جو لوگ اپنا حق وصول نہیں کرتے وہ غاصبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

"لیکن اس تجارت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" معظم علی نے یہ کہتے ہوئے سکوں کی تھیلی اکبر خاں کے گھوڑے کی خرجین میں ڈال دی۔

اکبر خاں نے احتجاجاً کہا۔ "بھائی جان مجھے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تمھیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تجارت میں جو نفع کماؤ اس کی ایک ایک کوڑی اپنے علاقے کے آدمیوں کو مسلح کرنے پر صرف کرو اس ملک میں صرف روہیلکھنڈ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ بدطینت، خود غرض، اور مفلوج حکمرانوں کی ہوس اقتدار سے آزاد ہیں۔"

اکبر خاں نے لاجواب ہو کر کہا۔ "میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روپے پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔"

معظم علی مسکرایا۔ "تمھیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں تمھیں کوئی غلط حکم نہیں دوں گا۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

اسی دن گیارہ بجے کے قریب وہ تنہا بالائی منزل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ایک عورت جو اپنا جسم ایک میلی کچیلی چادر میں ڈھانکے ہوئے تھی، حویلی کے صحن میں داخل ہوتی۔ نوکر صحن میں بندھے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے۔ عورت ایک گھوڑے کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گھوڑے نے اچانک بدک کر اپنے گلے پاؤں اٹھا لیے۔ عورت گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ایک نوکر نے اس کی بدحواسی پر قہقہہ لگایا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے کونے کی طرف چلی گئی۔

معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور اس نے نوکر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ایک غریب اور بے بس عورت پر ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی اور یہ گھوڑا یہاں کس نے باندھا ہے؟ اسے یہاں سے ہٹاؤ اور راستے سے دوسرے گھوڑے بھی کھول کر ایک طرف باندھ دو۔ یہ کھونٹے بھی یہاں سے اکھاڑ دو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالاخانے پر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دلاور خاں ایک طشت میں کھانا لے کر آگیا۔ معظم علی نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں۔ تم یہ کھانا ان غریب عورتوں کو دے آؤ جو ہماری حویلی میں رہتی ہیں اور میری طرف سے انھیں یہ کہو کہ آئندہ انھیں دونوں وقت کا کھانا ہمارے لنگر خانے سے ملا کرے گا۔"

شام کے وقت معظم علی بستی کی چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آرہا تھا کہ حویلی میں نوکروں کا شور سنائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے آکر وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کے ایک سرکش گھوڑے نے کود کر ایک نوکر کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ معظم علی نے نوکر کی ٹانگ پر اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی اور کہا۔ "یہ گھوڑا بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے میں کل صبح اس پر سواری کروں گا۔"

اگلی صبح معظم علی گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو گھوڑا پسینے سے

تر تھا اور اس کی تمام شوخی ختم ہو چکی تھی لیکن جب معظم علی حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گھوڑے نے پھر کودنا شروع کر دیا۔ اچانک چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت ڈیوڑھی سے باہر نکلی اور بے خیالی میں گھوڑے کے سامنے آگئی۔ معظم علی نے جلدی سے گھوڑے کی باگ موڑی لیکن بدحواس عورت رُکنے یا پیچھے ہٹنے کی بجائے گلی کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں گھوڑے سے ٹکرائی اور منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ گر کر چکنا چور ہو گیا۔ معظم علی نے پوری قوت کے ساتھ باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور نیچے کود کر بھاگتا ہوا عورت کے قریب پہنچا وہ بیہوش تھی۔ چادر اس کے سر سے کھسک چکی تھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک زندگی کی تمام حسیات سمٹ کر معظم علی کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ سازِ ہستی کے ٹوٹے ہوئے تار دوبارہ جڑ چکے تھے اور زندگی کی اداس اور مغموم فضائیں محبت کے نغموں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ اندھیری رات کے مسافر کے راستے کا ہر پتھر ایک چراغ بن چکا تھا۔ "فرحت! فرحت!" اس نے کہا اور پھر کسی توقف کے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح مسرت کے ساتویں آسمان پر تھی۔

نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے فرحت کو چارپائی پر لٹا دیا۔ نوکر جو وہاں جمع ہو چکے تھے، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ معظم علی کی خوشی اب پریشانی اور گھبراہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے صابر کو آواز دے کر پانی مانگا۔ صابر پانی کا کٹورا لے آیا اور معظم علی فرحت کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

فرحت نے آنکھیں کھولیں اور معظم علی کی کائنات مسکراہٹوں سے لبریز ہو گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "فرحت فرحت میں معظم علی ہوں!"

فرحت مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ آنسو

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

اس کی آنکھوں سے اُمڈ پڑے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں پہلے بھی ایسے خواب دیکھ چکی ہوں"

"ہم دونوں ایسے خواب دیکھ چکے ہیں۔ فرحت! تم کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں گرنے کے بعد مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں کب سے یہاں ہوں؟ مجھے امی جان کے پاس جانا چاہیئے۔ وہ بیمار ہیں۔ میں ان کے لیے دودھ لینے جا رہی تھی"

فرحت یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

معظم علی نے کہا: "نہیں یہیں رہو۔ میں تمھاری امی جان کو لے آتا ہوں"

"نہیں نہیں آپ وہاں نہ جائیں۔ وہ کوٹھڑی اس قابل نہیں کہ آپ اس میں پاؤں رکھیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "فرحت کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو! میں تم کو دلی سے لے کر حیدرآباد تک تلاش کر چکا ہوں"

فرحت نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اب دنیا میں ہماری کسی کو تلاش نہیں ہوگی۔ کبھی میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اس حالت میں شاید آپ ہمیں پہچان بھی نہ سکیں۔ میں ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی کہ آپ کسی دن ضرور آئیں گے۔ جب مالکِ مکان آپ کی طرف سے روپے لے کر آیا تھا تو میں نے اس سے آپ کا نام پوچھا تھا۔ اگلے دن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی کہ مجھے آپ کی جھلک دکھائی دی"

"اور اس کے باوجود تم نے مجھے اپنا پتہ دینا گوارا نہ کیا؟"

"مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ میں سوچتی تھی کہ جب میں یہ کہوں گی کہ میں فرحت ہوں تو میری صورت دیکھ کر آپ قہقہہ لگائیں گے اور اپنے نوکروں سے کہیں گے کہ اس پگلی کو حویلی سے باہر نکال دو۔ میں نے امی جان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور وہ یہ کہتی تھیں کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔ تمھیں ہر آدمی معظم علی نظر آتا ہے

مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں ہوش میں ہوں اور آپ مجھ سے اس قدر قریب ہیں"

فرحت بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

معظم علی نے کہا۔ "فرحت چلو تمھاری امی جان کے پاس چلتے ہیں"

فرحت اپنے جسم پر چادر لپیٹنے کے بعد معظم علی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ نوکر صحن میں ایک جگہ جمع ہو کر پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحت کو معظم علی کی موجودگی کے سوا اب کسی بات کا احساس نہ تھا۔ وہ خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی اور اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ حویلی کے کونے میں قدِ آدم اونچی دیوار کے ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ تنگ صحن کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں!"

کوٹھڑی سے ایک نحیف آواز سنائی دی۔ "فرحت تم نے اتنی دیر کہاں کردی؟"

فرحت کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں ایک میلے کچیلے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت نے آگے بڑھ کر بے اختیار سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر ماں کے سینے پر رکھ دیا۔

"فرحت! فرحت! کیا ہوا بیٹی؟" ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا: "خدا کے لیے بتاؤ تمھیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"

فرحت نے کہا: "امی جان وہ مل گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ میں پگلی ہوں"

"کون مل گئے ہیں؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"امی جان یوسف علی کے بھائی آپ کو دیکھنے آئے ہیں" فرحت نے گردن اٹھا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا: "بیٹی تمھیں کیا ہوگیا ہے کہاں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ہیں وہ؟"

معظم علی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ کی بیوی کی بے سروسامانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے کہا "چچی جان میں معظم علی ہوں۔"

عابدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت نے جلدی سے دوسری چارپائی کا میلا کچیلا بستر لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا "بیٹھ جائیے۔"

معظم علی نے آگے بڑھ کر عابدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چچی جان آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی طبیب کو بلاتا ہوں۔" پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور عابدہ کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ معظم علی نے فرحت سے سوال کیا "چچی جان کب سے بیمار ہیں؟"

فرحت نے جواب دیا۔ "اباجان کی وفات کے بعد سے ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پچھلے مہینے ان کی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی لیکن اب کوئی دو ہفتے سے پھر بخار رہتا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "چچی جان یہ کوٹھڑی آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ آپ چل سکیں گی یا میرے نوکر آپ کی چارپائی اٹھا کر لے جائیں؟"

عابدہ نے کہا "بیٹا مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔"

عابدہ نے جواب دیا "بیٹا تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو، مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔"

معظم علی نے کہا۔ "چچی جان میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ آپ کچھ دیر بالاخانے میں قیام کریں، اس کے بعد میں شام سے پہلے شہر میں آپ کے

لیے بہترین مکان کا بندوبست کردوں گا۔ میں نے شہر کے بہترین طبیب کے پاس آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ طبیب کی آمد سے پہلے پہلے آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں۔" معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن عابدہ نے کہا "بیٹا آدمیوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں چل سکتی ہوں لیکن تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو۔"

معظم علی نے کہا "میرے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑی ہوئی ہیں۔ فرحت اٹھو اور اپنی امی جان کو سہارا دے کر بالاخانے پر لے چلو!"

عابدہ نے کہا "بہت اچھا بیٹا! لیکن ہم شہر نہیں جائیں گے۔"

فرحت نے کہا "اگر آپ ہمیں اس لیے شہر بھیجنا چاہتے ہیں کہ ہمیں بالاخانے پر رہنے سے آپ کے دوستوں اور مہمانوں کو تکلیف ہوگی تو ہمیں یہیں پڑا رہنے دیں۔"

معظم علی نے جواب دیا "مجھے صرف آپ کی تکلیف کا خیال تھا لیکن اگر آپ بالاخانے میں رہنا پسند کریں تو میرا کوئی دوست یا مہمان آپ کی اجازت کے بغیر اس حویلی میں داخل نہیں ہوگا۔"

○

تھوڑی دیر بعد عابدہ بالاخانے کے ایک کشادہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت اس کی چارپائی پر پائینتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور معظم علی ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عابدہ کے سوالات کے جواب میں معظم علی نے مختصراً اپنی قید، رہائی اور سفر کے واقعات بیان کیے اور اس کے بعد عابدہ سے اپنی سرگزشت سنانے کو کہا۔

عابدہ نے جواب میں اپنے مصائب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہا "بیٹا تمھاری گرفتاری کے بعد ہمارے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ میر میرن کسی نہ کسی بہانے ہماری

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ محلے کے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم فوراً مرشد آباد سے نکل جائیں۔ اگلے دن ہم نے قافلے کے ساتھ مرشد آباد سے ہجرت کی۔ شہر کے دروازے پر میر جعفر کے سپاہیوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم سے چھین لیا۔ راستے میں فرحت کے ابا جان بیمار ہو گئے۔ چند دن وہ بیماری کی حالت میں قافلے کا ساتھ دیتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہمارے ساتھ آگرے کا ایک نیک دل تاجر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب ہمیں مجبوری کی حالت میں ایک بستی میں رُکنا پڑا تو اس تاجر نے چند روپے فرحت کے ابا جان کو پیش کرتے ہوئے کہا "آپ کو لکھنؤ پہنچنے کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی اس لیے اسے قبول فرمائیں"۔ فرحت کے ابا جان نے اس کے اصرار پر یہ روپے لے لیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بستی کے زمیندار کو ہمارے متعلق بہت تاکید کی۔ زمیندار بھی کوئی نیک آدمی تھا اور اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ فرحت کے ابا جان کی وفات کے بعد جب ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا تو ہم اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دو نوکر ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا قافلہ رات کے وقت لکھنؤ کے قریب پہنچا اور بہت سے آدمیوں نے شہر میں جانے کی بجائے اس سرائے میں قیام کیا۔ ہم بھی یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں رات گزارنے کے بعد صبح ہم نے شہر جا کر اپنے رشتہ داروں کا پتہ کیا لیکن ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد جا چکے ہیں۔ ہم سارا دن شہر میں گھومتے رہے لیکن کسی نے ہمارے حال پر توجہ نہ دی۔ شام کے وقت ہم پھر اسی سرائے میں واپس آ گئے۔

اگلے روز میں نے ایک نوکر کو اپنے رشتہ داروں کے نام خط دے کر حیدر آباد روانہ کیا لیکن اس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہمیں یقین تھا کہ حیدر آباد اطلاع پہنچتے ہی ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن آج تک ہم ان کی راہ دیکھتے رہے۔ ایک ماہ بعد جب ہماری پونجی

تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا دوسرا نوکر کہیں بھاگ گیا۔ ایک دن سرائے کے مالک نے ہمیں اطلاع دی کہ چند آدمی حیدر آباد جا رہے ہیں اگر آپ اپنے رشتہ داروں کو کوئی خط بھیجنا چاہیں تو وہ پہنچا دیں گے۔ میں نے خط لکھ کر ان کے حوالے کیا لیکن دو ماہ گزر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا اور میں یہ سمجھنے لگی کہ اب زمانے کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور ہمارے رشتہ داروں نے جان بوجھ کر ہماری طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اس حالت میں ان کے پاس جاؤں۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھیں میرا کوئی پیغام نہ ملا ہو اور میں حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن لکھنؤ سے قافلے کی روانگی سے دو دن قبل مجھے بخار ہو گیا اور مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا ہو تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ مرشد آباد جا کر ہمارا پتہ کرتے۔ اس کے بعد انھیں یقیناً یہ معلوم ہوتا کہ ہم لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب میں خدا کے سوا کسی کی مدد نہیں تلاش کروں گی۔ سرائے کا مالک ہمارے حال پر بہت مہربان تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت رحمدل تھی۔ وہ ہمارے لیے اس بستی اور کبھی کبھی شہر کی عورتوں سے بھی سلائی کا کام لے آتی تھی۔ جب وہ سرائے بیچ کر چلا گیا تو ہمیں بہت صدمہ ہوا لیکن سرائے کا نیا مالک بھی ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ کئی مہینوں سے یہ سرائے بالکل ویران تھی اور ہمیں یہاں وحشت ہوتی تھی لیکن اس بستی کے لوگ بہت شریف ہیں اور ان کا سلوک دیکھ کر میں نے شہر میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔

معظم علی نے کہا "چچی جان مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ فرحت نے جان بوجھ کر مجھے اپنا پتہ نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں"۔

عابدہ نے جواب دیا "بیٹا مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ تم یہاں ہو اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

فرحت کو اس بات کا ڈر تھا کہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمھیں تکلیف ہوگی اور شاید تم ہمیں پہچان بھی نہ سکو۔"

اتنے میں صابر نے دروازے کے پاس آکر آواز دی "جناب! حکیم صاحب تشریف لے آئے۔"

"انھیں اوپر لے آؤ!" معظم علی نے کہا۔

فرحت جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک عمر رسیدہ طبیب کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اس کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ طبیب نے عابدہ کی نبض دیکھی اور اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں جا کر ابھی دوا بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ کل تک بخار ٹوٹ جائے گا اور اگر کچھ افاقہ نہ ہوا تو میں انھیں کل شام دوبارہ آکر دیکھوں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک یہ تندرست نہیں ہوتیں، آپ ہر روز کم از کم دوبار انھیں دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ میں دونوں وقت آپ کے لیے گھوڑا بھیج دیا کروں گا۔"

طبیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا میں شام کو پھر آؤں گا۔"

معظم علی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صابر سے جو دروازے کے باہر کھڑا تھا، مخاطب ہو کر بولا۔ "صابر، دلاور خاں سے کہو کہ حکیم صاحب کے ساتھ جا کر دوا لے آئے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر طبیب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ قبول فرمائیے۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "نہیں! میں مریضہ کے تندرست ہونے سے پہلے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔"

معظم علی نے کہا "حکیم صاحب یہ علاج کا معاوضہ نہیں۔ یہ شہر سے یہاں تک

آنے کی تکلیف کا صلہ ہے، لیجیے۔ جب مریضہ تندرست ہو جائے گی تو میں جی کھول کر آپ کی خدمت کروں گا۔"

معظم علی کے اصرار پر طبیب نے چند سکے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیے لیکن حویلی سے باہر نکل کر اس نے جیب سے چاندی اور سونے کے سکے نکال کر دیکھتے ہوئے دلاور خاں سے کہا۔ "تمھارا مالک بہت امیر آدمی معلوم ہوتا ہے!"

دلاور خاں نے فخر سے جواب دیا۔ "جناب میرا مالک بادشاہ ہے۔"

"لیکن وہ عورت تو بہت غریب معلوم ہوتی تھی۔"

دلاور خاں نے جواب دیا۔ "جناب جب آپ دوسری دفعہ تشریف لائیں گے تو وہ آپ کو غریب نہیں معلوم ہوگی۔ خاں صاحب نے بالاخانے کے کمرے انھیں دے دیئے ہیں اور خود نیچے آگئے ہیں۔"

دلاور خاں کا قیاس صحیح تھا۔ جب شام کے وقت طبیب دوبارہ عابدہ کو دیکھنے آیا تو اس کا کمرہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ مریضہ بوسیدہ لباس کی بجائے نیا لباس پہنے ایک خوبصورت پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بخار بہت کم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری توقع سے پہلے تندرست ہو جائیں گی۔"

اگلے دن عابدہ کا بخار اتر چکا تھا اور وہ قدرے بشاش معلوم ہوتی تھی۔ تیسرے دن اسے پھر بخار آگیا لیکن شدت نسبتاً کم تھی۔ پانچویں روز طبیب نے اعلان کیا کہ اب انھیں انشاء اللہ بخار نہیں ہوگا۔

○

بالاخانے کے تمام کمرے فرحت اور اس کی ماں کے لیے وقف تھے اور معظم علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں آگیا تھا۔ جب تک عابدہ بیمار تھی وہ ہر روز متعدد بار اس کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کمرے میں حاضری دیا کرتا تھا لیکن عابدہ کے تندرست ہونے کے بعد اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر بالا خانے پر جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا۔ کبھی فرحت کی ماں بلاتی تو چلا جاتا اور اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے پر دستک دیتا۔ فرحت جو پہلے اپنی ماں کی موجودگی میں بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی اب اس کی آواز سنتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ معظم علی کے نوکروں میں سے صابر کے سوا کسی کو اوپر آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔

ایک شام صابر کھانا لایا تو معظم علی کو معمول سے زیادہ لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے کہا۔
"صابر آج کیا ڈالا ہے تم نے سالن میں؟"

صابر نے بدحواس ہو کر جواب دیا "جی میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں ڈالا۔ یہ سالن چھوٹی بی بی نے پکایا ہے اور میں نے تو چکھا بھی نہیں۔ صبح جب میں اوپر کھانا لے کر گیا تو وہ بہت خفا ہوئیں اور کہنے لگیں "آج شام ہنڈیا میں خود پکاؤں گی۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ آپ میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہتی تھیں — وہ کہتی۔۔۔۔"

"کیا کہتی تھیں وہ؟"

"کچھ نہیں، جی، وہ کہتی تھیں کہ تم گوشت کو دال سے بدتر بنا دیتے ہو۔"

معظم علی مسکرایا "صابر وہ بالکل درست کہتی تھیں۔ میں آج کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں لیکن انھیں تکلیف دینا ٹھیک نہیں"

"جی میں نے کہا تھا کہ آپ خفا ہوں گے لیکن انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اوپر باورچی خانہ نہیں ہے۔ وہ اصرار کرتی تھیں کہ آپ نیچے باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار بنوا دیں۔"

معظم علی نے کہا "ان سے کہنا کہ میں بہت جلد دیوار بنوا دوں گا اور انھیں نیچے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے لیے کھانا پکائیں۔ وہ اگر حاضر

تو باورچی خانے میں آکر تمھاری دیکھ بھال کر سکتی ہیں"

"میری دیکھ بھال؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا "میرا مطلب ہے کہ تم کھانا پکانے کے متعلق ان کی ہدایات لے سکو گے اور ہو سکتا ہے کہ تم بھی انھیں کچھ سکھا سکو۔"

صابر کو کھانا پکانے کے مسئلے میں کسی کی نکتہ چینی یا مداخلت پسند نہ تھی۔ اگر یہ مداخلت فرحت کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ یقیناً شدید احتجاج کرتا۔ تاہم اس نے کہا۔

"جناب یہ کھانا واقعی لذیذ ہے یا آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں؟"

معظم علی نے ہنستے ہوئے کہا "صابر تم بہت ہی سادہ دل ہو"

صابر نے کہا "جناب وہ بھی یہی کہتی تھیں"

"کون؟"

"چھوٹی بی بی جی۔ وہ تو یہ بھی کہتی تھیں کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے"

چند دن بعد نچلی منزل کے کمروں اور باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار تعمیر ہو چکی تھی اور مہمانوں کے لیے حویلی کے اندر صدر دروازے کے قریب تین نئے کمروں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔

○

گھوڑوں کی تجارت شروع کرنے سے پہلے معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے دل سے تنہائی اور بے کسی کا احساس دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت ہے لیکن فرحت کو تلاش کر لینے کے بعد وہ حوصلوں، ولولوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایک نئی دنیا میں آچکا تھا وہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں اپنی ذات کو دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا چاہتا تھا۔

ایک شام وہ گھوڑے پر سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو حویلی میں چند گاڑیاں کھڑی تھیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"یہ کیا ہے؟" اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا۔ "جناب شیر علی خاں واپس آ گئے ہیں۔"

"میں پوچھتا ہوں یہ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں اور شیر علی کہاں ہیں؟"

شیر علی ایک گاڑی کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گاڑیاں آپ کی ہیں۔ میں بنارس سے گھوڑوں کی قیمت وصول کر کے کپڑا خرید لایا ہوں۔ لکھنؤ میں بنارسی کپڑے کی بڑی مانگ ہے۔ انشاءاللہ ہمیں بہت فائدہ ہو گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "واہ جی، اب آپ گھوڑوں کے بعد مجھ سے کپڑوں کی تجارت بھی کروانا چاہتے ہیں!"

شیر علی نے جواب دیا۔ "اگر بنارس سے گھوڑے مل سکتے تو میں کپڑا نہ لاتا۔"

"اور اگر کپڑا نہ ملتا تو آپ کیا لاتے؟"

"کپڑا کیوں نہ ملتا۔ آپ دیکھیں تو سہی۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں میسور سے ہاتھی لانے کے متعلق سوچ رہا تھا اور آپ بنارس سے کپڑا اٹھا لائے ہیں!"

شیر علی نے اطمینان سے کہا۔ "میں آپ کو بتاؤں میں نے کپڑا کیوں خریدا؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ کہیں کاروبار جاری رکھنے کا ارادہ نہ بدل دیں اور اس کپڑے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ انشاءاللہ دو چار دن کے اندر اندر بک جائے گا اور ہمیں کافی نفع ہو گا۔"

"لیکن یہاں اسے خریدے گا کون؟"

"آپ دیکھتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حویلی لکھنؤ کی ایک اہم منڈی بن جائے گی۔"

معظم علی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مل گئی ہیں!"

"مبارک ہو مبارک ہو! کہاں ملیں؟"

"آپ کو یقین نہیں آئے گا وہ اسی حویلی کی ایک کوٹھری میں رہتی تھیں۔"

"اب وہ کہاں ہیں؟"

"میں نے بالاخانہ انھیں دے دیا ہے۔"

اگلے روز حویلی میں شہر کے پارچہ فروشوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا اور ایک دلال کپڑوں کے تھان نیلام کر رہا تھا۔

معظم علی نے ایک خوش رنگ ریشمی کپڑے کے دو تھان نکال کر صابر کو دیتے ہوئے کہا۔ "صابر یہ اوپر دے آؤ۔" اس کے بعد اس نے چند اور تھان نکال کر دلاور خاں کو دیتے ہوئے کہا۔ "دلاور خاں یہ کپڑا گاؤں کے چودھری کے گھر لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اسے بستی کے غریب اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیں۔"

تین دن کے اندر اندر معظم علی کا سارا مال فروخت ہو چکا تھا اور شیر علی خاں اسے حساب دکھانے کے بعد کہہ رہا تھا۔ "کیوں جی کیسی رہی ہماری یہ تجارت، اگر ہم اطمینان سے یہ مال فروخت کرتے تو اس سے دوگنا نفع ہوتا۔ اب بھی دس فیصدی نفع معمولی نہیں۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں نے فخر الدین کو لکھ دیا ہے کہ دو سو گھوڑے خرید کر یہاں روانہ کر دیں۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ہم میسور سے ہاتھی دانت، صندل اور گرم مصالحہ خرید کر لائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اکبر خاں آئے تو میں اسے آپ کے ساتھ حیدرآباد بھیجوں لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح دیر ہو جائے گی۔"

شیر علی نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں حیدرآباد سے گھوڑوں کے آنے سے پہلے

(c) ketabton.com: The Digital Library

بنارس کا ایک اور چکر لگا آؤں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "مجھے یقین ہے کہ یہ کپڑوں کا مسئلہ ہمیں بہت پریشان کرے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ چند دن آرام کریں۔ اس عمر میں آپ کے لیے زیادہ کام کرنا ٹھیک نہیں۔"

شیر علی نے جواب دیا: "مصروفیت میرے لیے سب سے بڑا آرام ہے میں صرف بیکار بیٹھ کر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں۔"

○

معظم علی کا کاروبار آئے دن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ سارا دن کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور دفتری کاغذات کے علاوہ کتابیں بھی اس کے کمرے میں انتہائی بے ترتیبی کی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ کسی نوکر کو کوئی کاغذ یا کتاب ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے فرصت ملتی تو وہ اپنی موجودگی میں نوکروں کو صفائی کا حکم دیتا لیکن چند دن بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔

ایک رات، دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر معظم علی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کی ہر چیز اپنی توقع کے خلاف دکھائی دی۔ کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ کاغذات ایک ترتیب کے ساتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف تبدیل ہو چکا تھا اور تمام غیر ضروری چیزیں کمرے سے غائب تھیں۔ معظم علی نے صابر کو آواز دی اور اپنے کاغذات اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صابر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا: "جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے چھوٹی بی بی کو منع کیا تھا لیکن وہ کہتی تھیں تم بالکل جانور ہو۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی۔ چھوٹی بی بی کہتی تھیں کہ تمہیں کوئی سلیقہ نہیں آتا اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کہا سرکار خفا ہوں گے لیکن انھوں نے کہا تم جاؤ میں خود صفائی کروں گی اور ہم

www.allurdu.com

تمھارے سرکار سے بالکل نہیں ڈرتے۔"

معظم علی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: "اچھا جاؤ میرا کھانا لے آؤ!"

اور جب وہ تھوڑی دیر بعد کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس کی طرف شرارت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا صابر کیا کہتی تھیں چھوٹی بی بی تمھیں؟"

"جی وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے جیسے میں کوئی گھوڑا ہوں اور جناب انھوں نے آپ کے متعلق بھی بہت کچھ کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ خفا ہو جائیں گے۔"

"نہیں نہیں بتاؤ!"

"جی وہ کہتی تھیں یہ رہنے کا کمرہ ہے یا کسی کباڑی کی دوکان ہے۔"

اگلی صبح اپنے کمرے سے نکلتے وقت معظم علی کو شرارت سوجھی اور اس نے چند کتابیں الماری سے نکال کر بستر پر پھینک دیں۔ پھر میز سے چند کاغذ اٹھائے اور اِدھر اُدھر بکھیر دیے لیکن جب وہ واپس آیا تو کمرہ اسی طرح سجا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر روز یہ محسوس کرتا کہ فرحت اس کی غیر حاضری میں اس کے کمرے کا معائنہ کرتی ہے لیکن ایک شام وہ شہر کے کسی تاجر سے کوئی معاہدہ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے کمرے میں کاغذات کے پرزے اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے تھے۔ بستر کی چادر میں سلوٹیں تھیں اور ایک کتاب جو رات کو اس نے پڑھنے کے لیے نکالی تھی تکیے کے پاس اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

صابر نے آکر کہا: "جناب کھانا لاؤں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ چھوٹی بی بی آج باورچی خانے میں آئی تھیں؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"نہیں۔ جی آج وہ سارا دن نیچے نہیں اتریں۔ صبح میں کھانا لے کر گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بی بی کہتی تھیں انھیں بخار ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "جاؤ دلاور خاں سے کہو فوراً طبیب کو لے آئے۔ نہیں ٹھہرو۔ میں خود جاتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ بعد، معظم علی نے بالاخانے کے ایک کمرے کے پاس جاکر آواز دی۔ "چچی جان! حکیم صاحب آئے ہیں!"

اندر سے آواز آئی۔ "حکیم صاحب! اچھا انھیں لے آؤ۔"

معظم علی کے اشارے پر طبیب کمرے میں داخل ہوا اور وہ خود تذبذب کی حالت میں دروازے سے باہر کھڑا رہا۔

عابدہ نے آواز دی۔ "معظم علی! بیٹا اندر آجاؤ باہر کیوں کھڑے ہو!"

معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ فرحت چادر میں اپنا منہ چھپائے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ معظم علی نے ایک کرسی اٹھا کر فرحت کی چارپائی کے قریب رکھتے ہوئے طبیب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

طبیب نے فرحت کی نبض دیکھی اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بخار بالکل معمولی ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد اتر جائے گا۔"

پھر اس نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس میں سے چار گولیاں نکال کر معظم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے دو گولیاں اسی وقت کھلا دیجیے اور دو آدھی رات کے وقت۔ صبح تک اگر بخار نہ اترا تو اپنا نوکر میرے پاس بھیج دیجیے گا۔"

تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے پر طبیب کو رخصت کرتے ہوئے معظم علی نے کہا۔ "حکیم صاحب مریضہ کے متعلق کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ میں بہت پریشان ہوا۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "تشویش کی کوئی بات نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔"

رات کو دیر تک معظم علی کو نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد اس نے اوپر جاکر دستک دی   ت کی ماں نے دروازے پر آکر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں چچی جان! فرحت کی طبیعت کیسی ہے؟"

عابدہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "بیٹا فرحت اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم نے رات کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔"

"چچی جان ...." معظم علی نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا!"

"میں ...."

"ہاں بیٹا کہو!"

"کچھ نہیں چچی جان۔ میں بہت پریشان تھا۔" معظم علی یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے میز کے سامنے بیٹھ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ چند سطریں لکھنے کے بعد اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ لپیٹ کر اس کے اوپر ریشم کا دھاگہ باندھتے ہوئے کہا "صابر! یہ اوپر چچی جان کو دے آؤ۔ دیکھو کہیں چھوٹی بی بی کے ہاتھ میں نہ دے دینا ورنہ تمھاری خیر نہیں۔ وہ بہت گالیاں دیں گی تمھیں۔"

"نہیں جی میں کوئی بیوقوف تھوڑا ہوں۔"

"اور دیکھو جواب کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر کر انتظار کرنا!"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے کورا کاغذ اور قلم دوات ساتھ لے کر جانا چاہیئے۔"

"نہیں نہیں جاؤ۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

صابر کرنے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "جناب اچھے بڑی بڑی بی بی آپ کو اوپر بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں انھوں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے، میں جواب لے جاتا ہوں لیکن انھوں نے الٹا مجھ پر ہنسنا شروع کر دیا۔ چھوٹی بی بی کہہ رہی تھیں یہ بالکل جانور ہے۔"

"تم نے چھوٹی بی بی کو تو خط نہیں دے دیا؟"

"نہیں جی۔ اب آپ بھی مجھے جانور سمجھنے لگ گئے ہیں کیا؟ میں نے اپنی طرف سے بہت احتیاط کی تھی لیکن بڑی بی بی نے خط پڑھنے کے بعد انھیں دکھایا۔ میں نے بہت کہا یہ خط چھوٹی بی بی کو نہ دکھایئے لیکن آج وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھیں۔"

معظم علی کمرے سے نکل کر بالا خانے پر پہنچا تو فرحت کی ماں دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ حیا کے مارے معظم علی کے گال اور کان سرخ ہو رہے تھے۔

عابدہ نے کہا: "آؤ بیٹا اندر آ جاؤ!"

معظم علی جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عابدہ نے کہا۔ "فرحت دوسرے کمرے میں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! فرحت تمھاری ہے وہ ہمیشہ تمھاری تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں کئی دنوں سے تمھارے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ ہمیں ٹھکرا چکا ہے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ تم لکھنؤ کے بڑے سے بڑے خاندان سے رشتہ حاصل کر سکتے ہو۔"

"چچی جان!" معظم علی نے آبدیدہ ہو کر کہا: "مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ اگر میں نے جلد بازی سے کام لیا تو آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آج بھی

جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔"

○

آٹھویں روز لکھنؤ کے بڑے بڑے گھرانوں میں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ ایک لاکھ پتی نوجوان نے اس بے سہارا لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ شہر سے باہر ایک بستی کی سرائے میں انتہائی مفلسی اور بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔

فرحت رات کے وقت دلھن کا لباس پہنے بستی کی عورتوں کے ہجوم میں بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ معظم علی دعوت ولیمہ پر جمع ہونے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ جب بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو فرحت کرسی گھسیٹ کر باہر کی طرف کھلنے والے دریچے کے سامنے بیٹھ گئی۔ افق سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ فرحت نے اٹھ کر آہستہ سے درمیان کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ عابدہ کے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ "امی جان!" اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاند اب بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں بادل گزر گیا اور چاند کی دلفریب کرنیں پھر ایک بار فضا میں نور کے خزانے بکھیر رہی تھیں۔ دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت نے مڑ کر دیکھا۔ معظم — اس کے سپنوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت کی نگاہیں جھک گئیں۔

معظم علی نے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرحت میں تصور میں تمھاری ہزاروں تصویریں دیکھ چکا ہوں لیکن تم ان سب سے زیادہ حسین ہو۔"

فرحت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

معظم علی مسکرایا: "تمھارے ہاتھ بھی خوبصورت ہیں۔"

[illegible]ت نے جلدی سے چہرے پر آنچل ڈال لیا اور اپنے ہاتھ اوڑھنی کے اندر چھپا لیے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

معظم علی نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "فرحت اِدھر دیکھو چاند پر بادل آ گیا ہے لیکن اس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں میر حبیب کی قید میں تھا۔ تو اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی دراڑوں سے کبھی کبھی چاند کی جھلک دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید اس وقت تم بھی اپنے محل کے کسی دریچے میں کھڑی ہو کر چاند کی طرف دیکھ رہی ہوگی۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب زندگی میں ہمارے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں تو میں نے چاند اور ستاروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا تھا لیکن تم میری نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہو سکیں۔ معظم علی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ فرحت مسکرا رہی تھی لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

معظم علی نے کہا۔ "فرحت تمھیں وہ دن یاد ہے جب میں تمھارے کتب خانے میں کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھیں اور پھر جب مرہٹوں نے تمھارے محل پر حملہ کیا تھا اور میں تم پر برس پڑا تھا لیکن تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔"

فرحت نے جواب دیا۔ "یہ یادیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔"

معظم علی کا چہرہ اچانک مغموم ہو گیا اور وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ فرحت نے چند بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ پریشان ہیں۔" فرحت نے کہا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "پریشانیاں ہماری میراث ہیں — فرحت جب میں بنگال کی فوج میں ملازم ہوا تھا تو اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مفلس اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اپنی کمائی اسی طرح لٹاتے رہو گے تو اپنی بیوی کو حق مہر میں کیا دو گے۔ میں نے جواب دیا کہ میری رفیقۂ حیات کا مہر ایک ایسا ملک ہوگا جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے آزاد ہو۔ فرحت، وہ تلوار جو میں نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت

کے لیے اٹھائی تھی، اب ٹوٹ چکی ہے۔ اب اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس باشندے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ پیغام دینے کے قابل ہوں کہ تمھاری عزت اور آزاد ہے۔ ہم تاریک رات کے مسافر ... در خدا معلوم ہماری آخری منزل کیا ہوگی۔ مجھے موقع پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن کاش میں تمھیں مستقبل کے متعلق کوئی پیغام دے سکتا۔ فرحت فرض کرو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں اسی وقت یا چند گھنٹے کے اندر اندر مرہٹوں کے خلاف ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کے لیے جا رہا ہوں تو، کیا محسوس کرو گی؟"

فرحت نے جواب دیا۔ "میں — میں یہ کہوں گی کہ میں مرزا حسین بیگ کی بیٹی اور آصف اور افضل کی بہن ہوں۔ میرے شوہر کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں اسے اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے سے منع کروں گی۔"

معظم علی نے کہا۔ "فرحت مجھے تم پر فخر ہے۔"

فرحت مسکرا رہی تھی اور معظم علی کو اس کی مسکراہٹ کا ایک ایک لمحہ ماضی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ وہ میدانِ جنگ کی کلفتیں اور قید و بند کی اذیتیں بھول چکا تھا۔ مستقبل کے افق پر اٹھنے والی تاریک گھٹائیں اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ اس کے سامنے صرف حال تھا۔ اس کی کائنات سمٹ کر اس کے کمرے کی چار دیواری تک محدود ہو رہی تھی، جس کا ہر گوشہ فرحت کی مسکراہٹوں سے منور تھا اور اس کمرے سے باہر کی دنیا پر ماضی اور مستقبل کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔

فرحت نے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھیے!"

"لیکن میں نہیں پوچھتی۔ آپ برا مانیں گے۔"

"خدا کے لیے ضرور پوچھیے ورنہ مجھے بہت پریشانی ہوگی۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"اچھا یہ بتلایئے کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا؟"

"کونسی لڑکی؟"

"وہ جو آپ کو حیدرآباد کے راستے میں ملی تھی۔"

"شیخ فخرالدین کی بھانجی؟ اس کا نام بلقیس تھا۔"

فرحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب میں بڑی صاحبزادی کے متعلق پوچھتی ہوں۔"

"اس کا نام عطیہ تھا لیکن تمھیں اس وقت اس کا خیال کیسے آیا؟"

"بس یوں ہی آگیا۔ اچھا یہ بتلایئے کہ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی؟"

"میں نے کب کہا کہ وہ خوبصورت تھی۔ میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔"

"لیکن آپ نے یہ تو کہا تھا کہ چھوٹی لڑکی کی شکل بہت پیاری ہے وہ بھی تو اس کی بہن تھی۔"

"ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت ہو لیکن میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

فرحت کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ اگر عطیہ کی جگہ میں ہوتی تو کیا کرتی۔ آپ کو حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد کبھی اس کا خیال نہیں آیا؟"

معظم علی نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "فرحت، میرے دل و دماغ میں اگر خیالات کے لیے کوئی جگہ تھی تو وہ تمھارے تصور سے پُر ہوچکی تھی۔"

فرحت نے کہا: "یہ عجیب بات ہے۔ میں نے جس دن سے اس لڑکی کے متعلق سنا ہے، میرے دل میں باربار خیال آتا ہے کہ کسی دن حیدرآباد جاکر اسے دیکھوں۔ نہ جانے کیوں میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک بہن کی شفقت محسوس کرتی ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "ممکن ہے ہمیں کسی دن حیدرآباد جانا پڑے۔"

تیرھواں باب

معظم علی کا تجارتی کاروبار آئے دن وسیع ہوتا جارہا تھا۔ اس کی دولت اور فیاضی کے تذکرے زبانِ زدِ عام تھے۔ اس کے دروازے پر غریب اور نادار لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لکھنؤ کے امراء اور فوجی افسر اس کا احترام کرتے تھے۔ حویلی کے اندر اس کا ایک شاندار رہائشی مکان اور مہمانوں اور نوکروں کے لیے کمرے تعمیر ہوچکے تھے۔ گھوڑوں کے اصطبل اور گودام پاس ہی ایک اور احاطے میں منتقل ہوچکے تھے۔ گھر میں معظم علی کو زندگی کا ہر آرام میسر تھا۔ پرانے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہوچکے تھے۔ فرحت کی رفاقت کے باعث زندگی کا ایک بھیانک خلا پُر ہوچکا تھا۔ تاہم وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ ماضی کی تاریکیاں ابھی تک اس کا پیچھا کررہی ہیں اور یہ احساس کبھی ان تمام مسرتوں پر حاوی ہوجاتا جو اسے فرحت کی رفاقت میں حاصل تھیں۔ وہ فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا اور اپنے دل میں یہ کہتا: "میری زندگی! یہ دنیا تمھاری مسکراہٹوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن کاش ان مسکراہٹوں کی روشنی ان تاریک پردوں کے پار جاسکتی جو ہمارے حال اور مستقبل کے درمیان حائل ہیں۔" وہ ماضی کو بھول سکتا تھا لیکن حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جن آندھیوں اور طوفانوں کے ساتھ لڑنے میں اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن گزارے تھے۔ وہ پھر ایک نئی شدت کے ساتھ مستقبل کے افق پر ظاہر ہورہے تھے۔

مرشدآباد کے قیدخانے سے نکلنے کے بعد اس کی ساری توجہ فرحت کی تلاش پر مرکوز

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

تھی اور قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل اس کے لیے ایک ثانوی حیثیت اختیار کرچکے تھے لیکن فرحت کو پالینے کے بعد ان آندھیوں اور طوفانوں کا چہرہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ بھیانک نظر آتا تھا وہ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سارے باغ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اودھ کی سرزمین کو ان انسانی بھیڑیوں سے بچانا چاہتا تھا جو بنگال کی طرح کرناٹک، دکن اور شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں کو اپنی شکارگاہیں بنا چکے تھے۔ اکبر خاں نے چھ ماہ قبل اسے جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ میں اپنے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہوچکا ہوں۔ ان دنوں ہم محاصرے کی حالت میں ہیں۔ دتاجی سندھیا ہم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے کمک کا انتظار کر رہا ہے لیکن نجیب الدولہ کو یقین ہے کہ احمد شاہ ابدالی اب کسی تاخیر کے بغیر ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہوچکی تھی۔ پھر معظم علی قریباً ہر روز لکھنؤ کے امراء کی محفلوں میں اس قسم کی خبریں سنا کرتا تھا کہ آج احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ عبور کرلیا ہے ۔۔۔ لاہور کا مرہٹہ گورنر وہاں سے پسپا ہوکر دلی بھاگ آیا ہے ۔۔۔ احمد شاہ اب لاہور سے دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں روہیلہ سردار افغان لشکر کے ساتھ شامل ہوگئے ہیں اور اب یہ لشکر مرہٹوں کو دلی کی طرف ہانک رہا ہے ۔۔۔ دلی کے غدار وزیر عماد الملک غازی الدین نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے دلی کے شہنشاہ عالم گیر ثانی اور اس کے وزیر اعظم انتظام الدولہ کو قتل کروا دیا ہے اور کسی اور شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا ہے ۔۔۔ دتاجی سندھیا نجیب الدولہ کا پیچھا چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ ہوچکا ہے۔ ابدالی نے تراوڑی کے قریب مرہٹہ افواج کے ہراول دستوں کو شکست دی ہے ۔۔۔ افغان لشکر نے دریائے جمنا عبور کرلیا ہے اور سہارنپور کے قریب پہنچ گیا ہے ۔۔۔ احمد شاہ ابدالی اب دلی

کی طرف بڑھ رہے ہیں، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، سعد اللہ خاں، مولا سردار اور دوسرے روہیلہ اکابر اس کے ساتھ شامل ہوگئے ہیں ۔۔۔ ابدالی نے دلی سے چھ میل دور لونی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا ہے ۔۔۔ دتاجی کی افواج نے افغان پڑاؤ سے دس میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈال دیا ہے ۔۔۔ ابدالی نے اچانک دریا عبور کر کے مرہٹہ لشکر کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ دتاجی مارا جاچکا ہے اور اس کا بھتیجا جن کوجی زخمی ہونے کے بعد رہی سہی فوج کے ساتھ کوٹ پتلی پہنچ گیا ہے ۔۔۔ راجپوتانہ سے ملہار راؤ ہلکر کی افواج جنکوجی کے ساتھ شامل ہوگئی ہیں ۔۔۔ مرہٹہ لشکر نے روہیلوں کے علاقوں میں تباہی مچا دی ہے ۔۔۔ مرہٹے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔۔۔ احمد شاہ ابدالی کے مشہور جرنیل جہان خان نے چودہ گھنٹے میں ستر میل یلغار کر کے اسکندر آباد کے قریب مرہٹہ افواج کو عبرت ناک شکست دی ہے اور ان شاندار فتوحات کے بعد احمد شاہ نے موسم برسات گزارنے کے لیے علی گڑھ کے قریب ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔"

ان حوصلہ افزا خبروں سے معظم علی اپنے سینے میں زندگی کی نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا لیکن یہ خبریں جس قدر حوصلہ افزا تھیں اسی قدر دکن کے حالات تشویشناک ہوتے جا رہے تھے۔ حیدر آباد کے توپخانے کا مشہور کمانڈنٹ ابراہیم گاردی جس نے فرانسیسی جرنیل سے تربیت حاصل کی تھی، نظام سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا۔ بالاجی نے گاردی کی خدمات حاصل کرتے ہی دکن پر حملہ کردیا اور احمد نگر کے مشہور قلعے کے محافظ کی غداری سے فائدہ اٹھا کر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کرلیا۔ احمد نگر کا قلعہ چھن جانے سے نظام کی فوج ایک اہم مستقر سے محروم ہوگئی تھی۔ دوسری طرف تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے باعث نظام کو اپنے سپاہیوں سے بغاوت کا بھی خطرہ تھا۔ تاہم ان کے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیشوا نے سداشیو راؤ کی قیادت میں چالیس ہزار فوج بھیجی۔ اس کے علاوہ ابراہیم گاردی کو اس کے مشہور توپخانے اور پانچ ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ روانہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کیا۔ ۳؍فروری ۱۷۶۰ء کو پونا سے دو سو میل دور اُدگیر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ مغل بہادری سے لڑے لیکن گاردی کے توپخانے نے انھیں سخت نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد دکن کے متعلق یہ خبر آئی کہ نظام نے سداشیو کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز شرائط پر صلح کرلی ہے اور بیجاپور، بیدار اور اورنگ آباد کے گرد و نواح کے علاقہ جات اور دولت آباد، اسیر گڑھ، احمد نگر اور برہان پور کے قلعہ جات پر ان کا قبضہ تسلیم کرلیا ہے۔

○

پونا میں ابھی تک اُدگیر کی فتح کی خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ پیشوا کو دتاجی کی موت اور جنکوجی اور ملہار راؤ ہلکر کی شکستوں کی خبریں ملیں۔ عام حالات میں شاید دتاجی سندھیا کی موت کو مرہٹہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ سمجھا جاتا لیکن مرہٹے ایک طرف دکن میں نظام کی قوّت مفلوج کرچکے تھے۔ دوسری طرف چندماہ قبل ان کی فتوحات کا سیلاب پشاور کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ گزشتہ کامیابیوں کے بعد مرہٹوں میں جو غرور اور خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی اس کے باعث یہ شکستیں پوری مرہٹہ قوم کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گئیں اور مہاراشٹر سے وہ فوجی قوت نمودار ہوئی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی بلونت راؤ میہن ڈھیل۔ شمشیر بہادر، باجی راؤ کا بیٹا مستانی، نارو شنکر وٹھل، شیودیو، ترمبک راؤ، پورن دھر، اناجی، مانکیشور اور بیشمار دوسرے بڑے اور چھوٹے مرہٹہ سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ قومی توہین کا انتقام لینے کے لیے پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، اس کے علاوہ ان کے ساتھ ابراہیم گاردی اپنے مشہور توپخانے اور نو ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس عظیم فوج کی کمان اُدگیر کے فاتح سداشیو راؤ (بھاؤ جی) کو سونپی گئی اور اس کے ساتھ پیشوا نے اپنے نوجوان ولی عہد بشواش راؤ کو روانہ کردیا۔ مرہٹہ لشکر ۱۰؍مارچ ۱۷۶۰ء کو پٹ دوڑ سے روانہ ہوا اور اورنگ آباد، برہان پور اور گوالیار کے راستے سفر کرنے کے بعد ۸؍جون کو دریائے چنبل کے کنارے پہنچ گیا۔ راستے میں جوں جوں یہ فوج شمال کی طرف بڑھتی گئی،

اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملہار راؤ ہلکر، جنکوجی سندھیا، داماجی، جسونت راؤ پھاوڑ اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے علاوہ لیٹروں اور پنڈاروں کے دستے ہر منزل پر اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہوچکی تھی۔ یہ صرف ایک فوج نہ تھی بلکہ پوری قوم کا فعال عنصر جمع ہوچکا تھا اور ان سب کا نعرہ یہ تھا کہ ہم افغانوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال کر دم لیں گے۔

دلّی کی طرف مرہٹہ لشکر کی رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل مرہٹوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی اور تیز رفتاری میں تھا۔ سیواجی کے زمانے میں مرہٹہ کیمپ میں کسی عورت کا لانا لعبید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی بھاری ساز و سامان بھی نہیں رکھتے تھے ایک مرہٹہ سپاہی کے لوازمات گھوڑے، اسلحے اور ایک تو بڑے تک محدود ہوتے تھے۔ اپنے لیے کھانا اور گھوڑے کے لیے چارا وہ راستے میں لوٹتے تھے۔ لیکن بھاؤجی کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ سامانِ رسد کی بیشمار گاڑیاں تھیں اور خیمہ بردار تھے۔ ریشمی خیمے ہاتھیوں پر لدے ہوئے تھے۔ مرہٹہ سردار زرتار کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چنبل کے مقام پر بھرت پور کا حکمران راجہ سورج مل جاٹ اپنے لشکر سمیت مرہٹوں کے ساتھ شامل ہوگیا لیکن بھاؤ کی خودسری کے باعث راستے میں ہی مرہٹوں کے ساتھ اس کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ مرہٹے جولائی کے آخر میں دلّی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ۲؍اگست کو انھوں نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ بھاؤ نے اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے لال قلعہ کو لوٹا اور دیوان عام کی چھت اور دیواروں میں لگی ہوئی چاندی اتار لی۔ لال قلعہ سے باہر بزرگانِ دین کے مزارات کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کیا۔ سورج مل جاٹ مرہٹوں کی اس حرکت سے خفا ہوکر واپس چلا گیا۔

موسم برسات کے دوران میں مرہٹے دلّی سے باہر پڑاؤ ڈال کر شہر اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں ابدالی بلند شہر کے ضلع میں انوب کے مقام

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا اور دونوں فریق نواب شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

○

معظم علی بلاناغہ صبح کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا۔ ایک دن سواری کے بعد وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا تو صحن میں ایک فوجی افسر کھڑا شیر علی سے باتیں کر رہا تھا اور معظم علی کا ایک نوکر اس کے گھوڑے کی باگ تھامے چند قدم دور کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر فوجی افسر سے کہا "لیجیے وہ آگئے۔" معظم علی نے گھوڑے سے اتر کر نوجوان افسر کے ساتھ مصافحہ کیا۔ افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "جناب مجھے محل کے داروغہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو اسی وقت محل میں طلب کیا گیا ہے!"

معظم علی نے کہا۔ "میں وہاں طلب کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"جناب مجھے کچھ معلوم نہیں۔ داروغہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں داروغہ کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو؟"

نوجوان افسر نے جواب دیا۔ "داروغہ نے آپ سے درخواست کی ہے حکم نہیں بھیجا۔"

"چلیے!" معظم علی نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد معظم علی اور فوجی افسر محل کی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی افسر نے کہا۔ "آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں داروغہ کو اطلاع دیتا ہوں۔"

معظم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوجی افسر باہر نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے گرمجوشی سے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آئیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے!"

معظم علی نے داروغہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات اس محل کے

رسوم و آداب کے خلاف نہ ہو تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا انتظار کرنے والے صاحب کون ہیں؟"

داروغہ نے جواب دیا۔ "آپ کو نجیب الدولہ نے بلایا ہے۔"

"نجیب الدولہ یہاں ہیں؟"

"جی ہاں، وہ کل یہاں پہنچے تھے لیکن ابھی تک ان کی آمد کو صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ اور میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ یہ بات اس محل سے باہر کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں لیکن میں حیران ہوں کہ انھیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!"

داروغہ نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ انھوں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کے متعلق پوچھا تھا۔"

معظم علی اپنے ذہن میں نجیب الدولہ کی سیماب پا شخصیت کی عجیب و غریب تصویریں لیے محل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک قوی الجثہ آدمی جس کے چہرے سے ذہانت اور شجاعت مترشح تھی، اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے بولا۔ "آپ شاید اس بات پر پریشان ہوں کہ میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف کیوں دی ہے اگر مجھے بعض مجبوریوں کا احساس نہ ہوتا تو میں سیدھا آپ کے ہاں آتا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میں اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں!"

"تشریف رکھیے۔ مجھے اکبر خان نے آپ کا پتا دیا تھا۔"

اکبر خاں کا نام سن کر معظم علی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

نجیب الدولہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "وہ کہاں ہے؟ مجھے اس نے کئی مہینوں سے کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے متعلق بہت پریشان ہوں۔"

"وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس ہے اور گزشتہ چند ماہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں بے حد مصروف رہا ہے اور میں اس کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا "آپ کو اس کی طرف سے معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اور شاید میں اس دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کو نہیں جانتا۔ میرے لیے اس کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ سلامت ہے۔"

نجیب الدولہ نے کہا "اس کا باپ میرا دوست تھا۔ میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں جرأت و ہمت کی نہایت قابل فخر روایات قائم کی ہیں اور میں جب کبھی اسے شاباش دیا کرتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے سب کچھ آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کے ساتھ میری ملاقات ایک مقصد کیلئے ہے اکبر خاں مجھے سپاہیانہ زندگی سے آپ کی کنارہ کشی کی وجوہات بتا چکا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ احمد شاہ ابدالی نے جس جنگ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی بقا کی خاطر لڑی جائے گی۔ مرہٹے اب ہمیشہ کے لیے اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں آپ جیسے باشعور آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شکست کھائی تو جو امیدیں ہم نے شمالی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وابستہ کی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ مرہٹے ایک ہو چکے ہیں اور ہمیں بھی ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس احمد شاہ ابدالی کا ایلچی بن کر آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ روہیلکھنڈ کے تمام سردار احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں لیکن ہمیں اپنے سپاہیوں کو فوراً تربیت دینے کے لیے آزمودہ کار افسروں کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں تو میری رضاکارانہ خدمات حاضر ہیں اور مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ میں اکبر خاں کی طرح بن بلائے آپ کی خدمت میں حاضر کیوں نہ ہوا۔"

محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "عالیجاہ حضور نواب صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"نہیں عالیجاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔" داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور معظم علی نے اٹھ کر کہا۔ "تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ کے اندر اندر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں ٹھہریئے!"

"لیکن نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "بیٹھ جائیے! نواب صاحب سے آپ کا تعارف ضروری ہے۔"

نواب اودھ اپنے شاہانہ لباس میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور نجیب الدولہ اور معظم علی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شجاع الدولہ اپنے مہمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ نجیب الدولہ نے کہا۔ "جناب یہ معظم علی خاں ہیں۔ لکھنؤ میں پناہ لینے سے پہلے یہ بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا ایک ہونہار شاگرد احمد شاہ ابدالی سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور میں ابھی ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے سپاہیوں کو تربیت دینے کے لیے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے میری درخواست قبول کر لی ہے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ ایک اچھے سپاہی کے لیے میری فوج میں بھی جگہ تھی۔ لکھنؤ میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"میں تجارت کرتا ہوں۔"

شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟"

"روہیلکھنڈ کا ایک نوجوان سردار اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گزار چکا ہے اور اس کی بدولت میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔"

شجاع الدولہ چند ثانیے خاموش رہا۔ معظم علی نے اس محفل میں اپنی موجودگی کو دخل در معقولات سمجھتے ہوئے اٹھ کر کہا "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا! اگر مجھے وقت ملا تو جانے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک اور ملاقات کی کوشش کروں گا لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوا تو انشاءاللہ ہماری ملاقات احمد شاہ ابدالی کے کیمپ میں ہوگی۔"

نجیب الدولہ نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ مصافحہ کیا لیکن شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا۔ معظم علی دروازے کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر اچانک رک گیا پھر اس نے مڑ کر شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا "جناب اگر یہ گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے۔"

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ نجیب الدولہ اپنی مہم میں کہاں تک کامیاب ہوں گے، اور احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کے متعلق آپ کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا ہے۔ اس جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اگر خدانخواستہ اس ملک کے مسلمانوں کی اجتماعی بے حسی کے باعث احمد شاہ ابدالی کو شکست ہوگئی تو شمالی ہند میں ہمارا آخری دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ مرہٹوں نے صرف دلی پر قبضہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ پشاور سے کابل اور غزنی تک اپنی فتوحات کے پرچم لہرانے کی نیت سے میدان میں آئے ہیں۔ اگر کسی میدان میں انھیں فیصلہ کن شکست نہ دی گئی تو وہ

دن دور نہیں جب دلی کی طرح لکھنؤ کی گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کے گھوڑے دوڑ رہے ہوں گے۔ لکھنؤ میں اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی ہیں کہ مرہٹوں نے آپ کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لیے دلی میں اپنے کٹھ پتلی حکمران کی وزارت کی پیش کش کی ہے اور آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

شجاع الدولہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا "یہ جھوٹ ہے اور مرہٹے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

معظم علی نے کہا "میری معذرت قبول فرمایئے لیکن عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اس قسم کی افواہوں کی تردید کی اشد ضرورت ہے اور تردید کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی افواج کو مرہٹوں کے خلاف کوچ کی تیاری کا حکم دیں!"

شجاع الدولہ نے جواب دیا "مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔"

"جناب مجھے معلوم ہے کہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں لیکن میں آپ کے کانوں تک اس قوم کی فریاد پہنچانا چاہتا ہوں جس کی شہ رگ تک ایک ایسے دشمن کی تلوار پہنچ چکی ہے جو عدل و انصاف اور انسانیت کے الفاظ سے ناآشنا ہے۔ میرے الفاظ بیشک تلخ ہیں لیکن آپ کو میرے خلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

○

تھوڑی دیر بعد معظم علی گھوڑے پر سوار اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔ شہر کے پر رونق بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے گرد و پیش کا احساس تک نہ تھا۔ وہ کوسوں دور کسی میدان میں ان افواج کے میلوں تک پھیلے ہوئے پڑاؤ دیکھ رہا تھا جو ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی تھیں۔ وہ لڑنے والوں کے نعرے، زخمیوں کی چیخ پکار، توپوں کی دھنا دھن

(c) ketabton.com: The Digital Library

بندوقوں کے دھماکے اور تلواروں کی جھنکار سن رہا تھا، اسے حدنگاہ تک لاشوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ پھر آگ اور خون کے طوفانوں سے نکل کر وہ اس مکان میں پہنچ چکا تھا، جہاں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ فرحت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میری زندگی! میں آگیا ہوں۔ خدا نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم ان درندوں کے دانت توڑ آئے ہیں جو اس ملک میں انسانیت کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن چکے تھے۔ میرے پیچھے وہ فوج آرہی ہے جس کے سپاہی مرہٹوں کی سطوت کے پرچم اپنے پیروں تلے روند چکے ہیں۔ اب یہ مجاہد ان فرنگی تاجروں کی چیرہ دستیوں سے ہمیں نجات دلائیں گے جنھوں نے بنگال میں ہماری عزت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس ملک میں انسانیت دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ اب ہماری منزل مرشد آباد ہے۔ ہم بہت جلد اس وطن کی مٹی کو آنکھوں سے لگائیں گے جہاں ہمارے شہیدوں کا خون گرا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہاں ایک کمرے میں فرحت اور اس کی ماں کے علاوہ دو اجنبی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں معظم علی جلدی سے واپس مڑا اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد فرحت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

معظم علی نے کہا۔ "فرحت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں تمھاری سہیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے بُرا تو نہیں مانا!"

فرحت مسکرائی۔ "وہ میری سہیلیاں نہیں تھیں۔ انھیں امّی جان نے بلایا تھا اور جاتے جاتے آپ کو ایک خوشخبری دے گئی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان تشریف لانے والے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "واہ یہ خوشخبری تو میں پچھلے ہفتے سن چکا ہوں۔"

فرحت مسکرائی۔ "امی جان کو اصرار ہے کہ شہر کی ہر تجربہ کار عورت باری باری مجھے دیکھنے

www.allurdu.com

کے لیے آئے۔ کل پڑوس کی کسی عورت نے ان عورتوں کا پتہ دے دیا تھا اور امی جان نے آج صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی صابر کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔"

معظم علی فرحت کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے خیالات کہیں اور تھے۔ فرحت نے کہا۔ "آج آپ پریشان نظر آتے ہیں خیر تو ہے! دلاور خاں کہتا تھا کہ آپ کو شجاع الدولہ نے بلایا تھا۔"

"نہیں! مجھے نجیب الدولہ نے بلایا تھا۔ وہ کل سے لکھنؤ میں ہیں، فرحت! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ننھے مہمان کی صورت دیکھنے سے پہلے میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

فرحت نے کہا۔ "لیکن آپ اگر کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "فرحت آج میں اس بات پر ندامت محسوس کر رہا ہوں کہ میں ان جنگوں سے غیر حاضر رہا ہوں جو ہماری قوم کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔ تم سن چکی ہو کہ مرہٹوں کا سیلاب اب دلّی پہنچ چکا ہے۔ احمد شاہ ابدالی ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے اور اسے ہر اس انسان کے تعاون کی ضرورت ہے جو اس ملک کے مسلمانوں کے متعلق سوچنے کا شعور اور ان کی بقا کے لیے تلوار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو۔"

فرحت نے کہا۔ "میں چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ آپ کوئی اہم فیصلہ کرنے والے ہیں اور پچھلے ہفتے جب آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ اب چند مہینے لکھنؤ سے باہر نہیں جائیں گے تو بھی مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ میری خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے تو میں سمجھوں گی کہ میں آپ کی رفیقۂ حیات بننے کی اہل نہ تھی۔"

آٹھ دن بعد معظم علی ایک سپاہی کا لباس پہنے فرحت کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی۔ معظم علی نے کہا "میں اپنی زندگی میں ایسی جنگیں لڑ چکا ہوں جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بے معنی تھیں لیکن اس دفعہ میں ایک ایسی جنگ میں حصّہ لینے کے لیے جا رہا ہوں جس کے نتائج بہت دُور رس ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں شمال مغرب کے علاقے ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری دفاعی حصار ثابت ہوں گے۔ اگر ہم مرہٹوں کو شکست نہ دے سکے تو یہ سیلاب عظیم کسی دن اٹک کے پار پشاور اور غزنی تک پہنچ جائے گا اور مسلمانوں کی حالت اس ملک کے شودروں سے بدتر ہوگی۔ فرحت میں اپنی شہرت اور ناموری کے لیے نہیں بلکہ قوم کی بقا کے لیے جنگ میں حصّہ لینے جا رہا ہوں یہ جنگ اس ملک کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں سپاہی ایسے ہوں گے جن کی لاشیں دشمن کے گھوڑوں کے پیروں تلے روندی جائیں گی۔ اگر میں واپس نہ آیا تو یہ سمجھنا کہ میرا مقصد میری ذات سے بلند تھا اور جو بچہ ہمارے ہاں پیدا ہوگا تم کسی دن اسے یہ بتا سکو گی کہ تمھارا باپ ان ہزاروں گمنام سپاہیوں میں سے ایک تھا جنھوں نے اپنی آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی قیمت اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے معظم علی نے اس کی طرف دیکھا اور بھرّائی ہوئی آواز میں "خدا حافظ" کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو فرحت اور اس کی ماں بالائی منزل کے دریچے میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھیں۔ جب معظم علی اور اس کے ساتھی حویلی سے باہر نکل گئے تو فرحت بے اختیار عابدہ کے ساتھ لپٹ گئی "امی جان!" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "دعا کیجیے کہ خدا انھیں فتح دے۔"

○

موسم برسات ختم ہو چکا تھا۔ بھاؤ نے نارو شنکر کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلّی کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر پیشقدمی کی اور دلّی سے اسّی میل دور شمال کی طرف جمنا کے کنارے افغانوں کے مشہور قلعہ کنج پورہ پر حملہ کر دیا۔ نجابت خاں دس ہزار روہیلہ جانبازوں کے ساتھ اس قلعے کی حفاظت پر متعین تھا لیکن مرہٹوں کے سیلاب کے آگے اس کی پیش نہ گئی۔ انھوں نے گاردی کے توپخانے کی گولہ باری کے بعد یلغار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ نجابت خاں اور سرہند کے سابق گورنر عبدالصمد خاں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس قلعے سے مرہٹوں کو اسلحہ اور بارود کے علاوہ رسد کے وہ ذخائر دستیاب ہوئے جو احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

دریائے جمنا طغیانی کے باعث ناقابلِ عبور تھا اور احمد شاہ ابدالی انتہائی رنج و ملال کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے مرہٹوں کے ہاتھوں اپنے بہترین ساتھیوں کے قتلِ عام کی خبریں سن رہا تھا لیکن جب مرہٹے کنج پورہ کے خزانے لوٹنے کے بعد دسہرے کی خوشیاں منا رہے تھے، احمد شاہ ابدالی دلّی سے بیس میل شمال کی طرف باغپت کے قریب جا نکلا۔ کشتیوں کے بغیر وہاں بھی دریائے جمنا کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوج کے افسر اور سپاہی دریا کی خشمگیں موجیں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے لیکن کسی کو امیرِ لشکر کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے توپیں ہاتھیوں پر لاد دی گئیں اور سواروں کے دستے دریا کے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ پھر امیر لشکر نے "اللہ اکبر" کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دریا میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، نصیر خاں بلوچ، مراد خاں ایرانی، برخوردار خاں، شاہ ولی خاں، جہان خاں اور دوسرے افغان، ایرانی، بلوچ اور روہیلہ سرداروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور پھر آن کی آن میں پوری فوج دریا کی موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ لشکر دریا کے پار پہنچ چکا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے عقب

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ ابدالی کی فوج کے چند دستوں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیشِ نظر آگے بڑھ کر صفیں باندھ لیں۔ چند ثانیے بعد بیس سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ اگلی صف سے کسی نے بلند آواز میں کہا: "یہ ہمارے ساتھی ہیں انھیں آنے دو۔" اکبر خاں اور معظم علی ان سواروں میں سب سے آگے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر بھاگتے ہوئے لشکر کی صفوں میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور روہیلکھنڈ کے دوسرے سرداروں سے باتیں کر رہے تھے۔ معظم علی کہہ رہا تھا: "یہاں سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر مرہٹوں کی ایک چوکی ہے اور اس چوکی کا صفایا کرنے کے بعد یہ علاقہ ہمارے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ وہاں سپاہیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں۔ مرہٹے اس وقت دسہرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ چند تیز رفتار دستے بھیج دیئے جائیں تو میں دوپہر سے پہلے پہلے ان کا صفایا کر سکتا ہوں۔"

حافظ رحمت خاں نے کہا: "ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے۔ چلیے آپ ہماری رہنمائی کریں!"

"ہمارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر معظم علی نے ایک نوجوان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

نوجوان نے کہا: "لیکن میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر گھوڑے سے اتارتے ہوئے کہا: "تم سن چکے ہو کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے!"

اکبر خاں نے اس کی تقلید کی اور اپنے قبیلے کے ایک سپاہی کا گھوڑا پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی چار سو سوار لشکر کی صفوں سے نکل کر گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے اور نجیب الدولہ، احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! اس کا نام معظم علی ہے، اس نے دو دن قبل اس علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے دریا عبور کیا

تھا اور اب وہ یہاں سے چھ کوس دور دشمن کی ایک چوکی کا صفایا کرنے جا رہا ہے، پھر یہ علاقہ بالکل محفوظ ہو جائے گا اور ہم اپنی پیشقدمی جاری رکھ سکیں گے۔"

اگلی رات مرہٹہ چوکی کے چند سپاہی جو روہیلہ دستوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے، بھاؤ جی کو یہ بتا رہے تھے کہ ابدالی کے لشکر نے اچانک دریا عبور کر کے ہماری چوکی کا صفایا کر دیا ہے۔

بھاؤ جی نے مرہٹہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو پانی پت کی طرف ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی پانی پت کا رُخ کیا اور مرہٹہ کیمپ سے آٹھ میل دور پڑاؤ ڈال دیا۔ مرہٹوں نے ابراہیم گاردی کی ہدایات کے مطابق شہر اور اپنے کیمپ کے گرد ساٹھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ گہری خندق کے پیچھے مٹی کے بلند پشتے پر جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں۔ بھاؤ کو امید تھی کہ اس کی پنڈارہ فوج احمد شاہ ابدالی کے رسد اور کمک کے راستوں پر حملہ کر کے اسے حملے پر مجبور کر دے گی لیکن ابدالی، مرہٹہ سپہ سالار کی نسبت کہیں زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھا۔ وہ دشمن کی خواہش کے مطابق اپنی فوج کو اس کی توپوں کے سامنے لانے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے اردگرد کے جنگلات سے بیشمار درخت کٹوائے اور پڑاؤ کے اردگرد لکڑی کے کھمبوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ابدالی کے اس اقدام سے مرہٹے ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ اپنے بھاری توپخانے کو ایک فیصلہ کن حربہ سمجھتے تھے لیکن بھاری ساز و سامان سے لیس ہونے کے باعث بدلے ہوئے حالات کے مطابق جنگ کا کوئی نیا نقشہ تیار کرنے کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے خندق کھودی تھی کہ احمد شاہ ابدالی ایک طوفان کی طرح آگے بڑھے گا اور ان کی توپیں خندق کے اردگرد افغان سپاہیوں کے ڈھیر لگا دیں گی لیکن اتنی بڑی تیاری کے بعد انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کیا سوچ رہا ہے! افغان لشکر اگر کھلے میدان میں نکل کر حملہ کرتا تو مرہٹے ابدالی کے ہر سوار کے مقابلے میں کم از کم پانچ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

سوار لا سکتے تھے۔ پھر اگر پڑاؤ میں مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ان کی بیویاں نہ ہوتیں تو ان کے لیے پسپا ہو کر جنگ کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا۔ اب ان کے لیے پڑاؤ سے باہر ہر جگہ غیر محفوظ تھی۔ اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کی فوج ہر وقت حالات کے مطابق نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ ابدالی کے سپاہی بھاری توپوں کی بجائے اپنے تیز دل تلواروں، بندوقوں اور گھوڑوں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

فریقین کے کیمپوں کے درمیان قریباً آٹھ میل کے خلا میں روزمرہ انفرادی شجاعت کے واقعات دیکھے جاتے تھے کبھی کوئی مرہٹہ ماتھے پر تلک لگا کر اپنے پڑاؤ سے نکلتا اور مسلمانوں کے پڑاؤ کے سامنے گھوڑا روک کر کسی افغان، کسی ایرانی، یا کسی بلوچ کو مقابلے کی دعوت دیتا۔ اسی طرح افغان فوج کے جوانمرد گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے پڑاؤ سے نکلتے اور مرہٹہ کیمپ کی خندق کے پل کے قریب رک کر انھیں دعوت مبارزت دیتے ابدالی کے کیمپ میں ایک نوجوان کی زندہ دلی اور جرأت کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں۔ وہ ہر روز ایک نئے بھیس میں اپنے کیمپ سے نکلتا اور دشمن کے دو چار سورماؤں کا غرور خاک میں ملا کر واپس آتا۔ ابدالی کے جانباز اسے کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کے لباس میں دیکھتے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کرتے۔ چند شاندار معرکوں کے بعد وہ نصیر خاں بلوچ سے ایک پٹکا، ملک جہان خان سے ایک تلوار، شجاع الدولہ سے ایک گھوڑا اور نجیب الدولہ سے ایک بندوق بطور انعام حاصل کر چکا تھا۔

یہ نوجوان اکبر خاں تھا۔ ایک دن احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا اور کہا: بیٹا میں تمھارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور تم اپنے آپ کو میری طرف سے بہترین انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔ تمھاری کوئی ایسی خواہش ہے جو میں پوری کر سکتا ہوں؟"

اکبر خاں نے انسانی سطوت و جبروت کے اس پیکر مجسم کی طرف دیکھا اور محبت

اور اطاعت کے جذبات سے مغلوب ہو کر گردن جھکا لی۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا۔ "بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

اکبر خاں نے گردن اٹھائی۔ اس کی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "عالیجاہ! میری صرف ایک خواہش ہے اور وہ آپ کے سوا کوئی پوری نہیں کر سکتا۔"

"کہو!"

"عالیجاہ! میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرہٹے دوبارہ اس سرزمین میں پاؤں نہ رکھیں۔" اور ان الفاظ کے ساتھ اکبر خاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے

احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا خدا مجھے ہمت دے۔ تمھاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی، اب میں تمھیں ایک حکم دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمھیں تنہا دشمن کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرہٹوں کا یوم حساب شروع ہونے والا ہے اور میں تمھیں اس دن کے لیے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش اس ملک میں چند اور نوجوان تم جیسے ہوتے؟"

اکبر خاں نے کہا: "عالیجاہ! میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس کا بچپن میرے بچپن سے اور جس کی جوانی میری جوانی سے بہتر تھی اور جواب بھی میرے لیے باعث رشک ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"عالی جاہ! وہ چھاپہ مار روہیلہ دستوں کا سالار ہے اور میں نے سب کچھ اسی سے سیکھا ہے۔"

۱۹ نومبر کو گاردی نے اپنی پیادہ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا لیکن اسے شدید نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا ہوا۔ تین دن بعد سندھیا نے یکے بعد دیگرے دو حملے کیے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۷ دسمبر کو روہیلوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی جھڑپ بلونت راؤ مہینڈیل کے دستوں کے ساتھ ہوئی۔ سخت لڑائی کے بعد بلونت راؤ مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ روہیلوں نے شکست خوردہ دستوں کا تعاقب کیا اور مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئے اور شام تک تباہی مچانے کے بعد واپس چلے آئے۔

قریباً اڑھائی ماہ فریقین کے درمیان اس طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس عرصہ میں دونوں فوجوں کے سامنے سپاہیوں کے لیے رسد اور گھوڑوں کے لیے چارے کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ مرہٹہ فوج کو زیادہ تر رسد دلی کے قلعدار نارو شنکر کی طرف سے پہنچتی تھی۔ نجیب الدولہ نے امیر لشکر سے مشورہ کرنے کے بعد معظم علی کی قیادت میں اپنی فوج کا ایک حصہ مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپے مارنے کے لیے بھیج دیا۔ چند دن کے بعد یہ چھاپہ مار دستے دلی اور پانی پت کے درمیان آمد و رفت کے تمام راستے بند کر چکے تھے اور مرہٹہ فوج قحط کا سامنا کر رہی تھی۔

افغان فوج کو زیادہ تر رسد روہیلکھنڈ کے علاقوں سے ملتی تھی۔ بھاؤ صاحب نے بندیل کھنڈ میں گوبند پنتھ کو صورت حالات سے باخبر کیا اور اس نے بارہ ہزار تیز رفتار سواروں کے ساتھ روہیلکھنڈ پر یلغار کر دی۔ چند دن میں وہ روہیلوں کے کئی علاقے تباہ و برباد کرنے کے بعد میرٹھ تک پہنچ چکا تھا اور افغان افواج کو خوراک کی ترسیل بند ہو چکی تھی۔ اب مرہٹہ کیمپ کی طرح افغان فوج کے پڑاؤ میں بھی قحط کے اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جرنیلوں نے اسے مشورہ دیا کہ ہمیں یا تو فوراً مرہٹوں پر حملہ کر دینا چاہیئے یا یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔ ورنہ ہمیں چند دنوں تک ایک خطرناک قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ احمد شاہ ابدالی کا جواب یہ تھا: "تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ انتظار کرو اور دیکھو، ہمارے مقدر میں فتح ہے پسپائی نہیں!"

احمد شاہ ابدالی کی جوابی کارروائی یہ تھی کہ اس نے مرہٹوں کے کیمپ کے گرد اپنا گھیرا

تنگ کرنا شروع کر دیا اور اپنے اور دشمن کے پڑاؤ کے درمیان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک اور چوکی قائم کر دی اور وہاں اپنے لیے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کروایا۔ یہ چھوٹا سرخ خیمہ اس عظیم فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا صفحہ الٹنے والی تھی۔ احمد شاہ ابدالی دن بھر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی بیرونی چوکیوں کا معاینہ کرتا اور بسا اوقات اسے ایک دن میں پچاس ساٹھ میل سواری کرنی پڑتی۔ رات کے وقت اس کی اگلی چوکی کے سپاہی دشمن کے پڑاؤ تک پہنچ جاتے اور باقی فوج کے کئی دستے مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپے مارتے۔

۱۷ دسمبر کو احمد شاہ ابدالی کے ایک جرنیل عطار خاں کی قیادت میں سواروں کی ایک فوج نے ایک دن میں پچاس میل یلغار کر کے گوبند پنتھ کو جا لیا اور بارہ ہزار مرہٹوں کے اس لشکر کو تہ تیغ کر ڈالا جو کئی دن سے رسد و کمک کے راستوں پر حملے کر کے افغانوں کو پریشان کر رہا تھا۔ چند دن بعد معظم علی اور اکبر خاں نے رات کے وقت مرہٹہ کیمپ کے ان دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو گھوڑوں کے لیے چارا تلاش کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔

۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو دلی سے ایک قافلہ جو مرہٹہ فوج کے لیے رسد اور تنخواہیں لے کر آ رہا تھا۔ افغان چھاپہ مار دستوں کے نرغے میں آگیا اور اس قافلے کے بہت کم آدمی ایسے تھے جنھیں افغان سواروں نے بچ نکلنے کا موقع دیا۔ اب مرہٹہ کیمپ پر بیچارگی، بے بسی اور خوف چھایا ہوا تھا۔ قریباً چار لاکھ انسان ایک ایسے پڑاؤ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے جہاں صفائی کا انتظام ناممکن تھا۔ سینکڑوں آدمی روزانہ بھوک سے مر رہے تھے اور سینکڑوں غلاظت اور تعفن کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ فوج جو اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے نشہ میں غزنی تک پہنچنے کا عزم لے کر نکلی تھی، اب کیمپ سے باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مرہٹے دن بھر اپنے پڑاؤ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کے چاروں طرف افغان شہسواروں کے تیز رفتار گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والا گرد و غبار دیکھتے تھے اور موسم سرما کی طویل اور اداس راتیں گزارنے کے بعد جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوتے تھے تو انھیں اپنے خیموں میں دشمن کی گولیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ بھوک سے مرنے والے انسانوں، گھوڑوں اور بیلوں کی لاشوں کا تعفّن میلوں تک پھیل چکا تھا۔ فضا میں دن بھر چیلوں اور گدھوں کے غول نظر آتے تھے۔

○

ایک دن احمد شاہ ابدالی کے خیمے میں فوج کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ صلح کے لیے مرہٹوں کی پیشکش پر غور کیا جا رہا تھا۔ شجاع الدولہ جس کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی تھی، احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا۔ "عالیجاہ! مرہٹے فاقہ کشی سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ صلح کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔ اگر ان کی پیشکش ٹھکرا دی گئی تو انھیں مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی فوجی قوت ایسی نہیں کہ انھیں آسانی سے شکست دی جا سکے۔ وہ دلّی خالی کر کے واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان سے یہ وعدہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ دوبارہ شمال کا رخ نہیں کریں گے، اگر ہم لڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجیب الدولہ ہزاروں جانیں ضائع کرنے پر کیوں مصُر ہیں؟"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "عالیجاہ! ہمارا مقصد مرہٹوں کو پانی پت کے میدان سے بھگانا نہیں بلکہ اس طاقت کو ختم کرنا ہے جو اس ملک میں مسلمانوں کی عزت اور بقا کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن چکی ہے۔ مرہٹے اب لڑے بغیر اس لیے واپس جانا چاہتے ہیں کہ انھیں لڑائی میں اپنی تباہی نظر آتی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ زیادہ تیاری کے بعد واپس نہیں آئیں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "ان کے سامنے یہ شرط پیش کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے چند

سرداروں کو بطور یرغمال ہمارے پاس چھوڑ دیں۔"

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "ہمارا معاملہ چند سرداروں کے ساتھ نہیں، مرہٹہ قوم کے ساتھ ہے جو پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا عزم کر چکی ہے، اگر چند سرداروں کی جان کا خطرہ اس کے ارادوں میں حائل ہو تو اسے نئے سردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ مجھے اپنے اکابر کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے جو ایک ایسے دشمن کے ساتھ سودا بازی سے زندہ رہنا چاہتے ہیں جس کی پوری تاریخ ریاکاری، بدعہدی اور مکر و فریب کی داستانوں سے لبریز ہے میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا جن کے ہاتھ میری قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے۔ جو طاقت ور کے سامنے بھیڑ اور کمزور کے سامنے شیر بن جاتا ہے۔ میں مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کرنے سے پہلے اپنے معزز دوست سے یہ گذارش کروں گا کہ وہ ہمارے ساتھ بحث کرنے سے پہلے اپنی فوج کے کسی معمولی سپاہی کے ساتھ مشورہ کر لیں۔ اگر وہ یہ کہے کہ مرہٹوں کے یہاں سے زندہ اور سلامت بچ نکلنے کے دو یا تین سال بعد لکھنؤ کی گلیاں ان کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے محفوظ ہوں گی تو میں اپنا موقف بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاؤں گا۔ مرہٹوں کی منزلِ مقصود پانی پت نہ تھی۔ ان کی نگاہیں کابل، قندھار اور غزنی پر تھیں۔ اب وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہاں آنا ایک احمقانہ فعل تھا اور ان کا یہ سمجھ لینا بھی ایک حماقت تھا کہ ہم آنکھیں بند کر کے ان کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب ان کے لیے اپنی غلطی کی تلافی کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے جائیں اور ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اگلے سال یا اس سے اگلے سال زیادہ تیاریوں کے ساتھ واپس آئیں۔ اگر ہم نے انھیں صحیح سلامت بچ نکلنے کی اجازت دی تو مستقبل کے مورخ ہمیں ان کی نسبت کہیں زیادہ احمق خیال کریں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

گے۔ میں آئندہ کسی وقت ان کے ساتھ لڑنے کی بجائے آج ہی ان سے نپٹ لینا بہتر سمجھتا ہوں اور اگر میرے معزز دوست حقیقت پسندی کا ثبوت دیں تو انھیں بھی یہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مرہٹے "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول کے قائل نہیں۔ اگر وہ جنگ کے میدان سے بچ نکلنے کے لیے ہمارے ساتھ مصالحت کرلیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ واپس جاتے ہوئے مہاراشٹر تک راستے کی بستیوں اور شہروں کو راکھ کے انبار بنا کر نہیں رکھ دیں گے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس تلوار کو وہ ہمارے سپاہیوں کے سامنے بے نیام کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ ان کے راستے کے نہتے اور بے بس انسانوں کے قتلِ عام سے دریغ کرے گی!"

عالیجاہ! میرے حلق میں چیخوں کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلّت و رسوائی کے دلخراش مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے روہیلکھنڈ کی بستیوں اور دلّی کے بازاروں میں ان درندوں کو انسانیت کا منہ نوچتے دیکھا ہے۔ میں ان کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرسکتا اور نواب شجاع الدولہ کو بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ انھیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے روہیلکھنڈ کی طرح اودھ کی سرحدوں پر بھی کوئی ایسی دیوار دکھائی نہیں دیتی جو مرہٹوں کی جارحیت کو روک سکتی ہو۔ مجھے تو ان سے یہ بات بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی کوششوں کے طفیل یہاں سے بچ کر نکلیں گے اور واپس جاتے ہوئے لکھنؤ میں اپنی وحشت اور بربریت کی ناقابلِ فراموش یادگار چھوڑ جائیں گے۔"

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ "نجیب الدولہ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے، اگر آپ حضرات کی رائے یہی ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ بہرحال جنگ کی جائے تو ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میری فوج کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔"

○

۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔ طلوعِ سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے اور اس کے ساتھ گیکوار کی فوجیں تھیں۔ میمنہ میں ملہار راؤ ہلکر اور جنکوجی سندھیا تھے۔ قلبِ لشکر میں بھاؤ اور بشواش راؤ ایک جنگی ہاتھی کے ہودج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیرِ اعظم شاہ ولی خان تھا اور اس کی کمان میں دُرانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانباز تھے جو کئی میدانوں میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ پسند خاں اور نجیب الدولہ تھے۔ شجاع الدولہ کی افواج میسرہ اور قلب لشکر کے درمیان تھیں۔ میمنہ کی قیادت برخوردار خاں کے ہاتھ میں تھی اور روہیلہ، مغل اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی عقابی نگاہوں سے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ برق رفتار سواروں کی ایک جماعت فوج کے جرنیلوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایات پہنچانے میں مصروف تھی۔ جنگ کی ابتدا مرہٹہ توپوں کی آتشبازی سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روہیلہ دستوں پر سنگینوں سے حملہ کر دیا۔ روہیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کر دیں۔ پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ گرد و غبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ، توپوں کی دھنا دھن، بندوقوں کے دھماکوں، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ پکار کے ساتھ ایک طرف سے "اللہ اکبر" اور دوسری طرف سے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلّایا "میرے رفیقو! تم کہاں جا رہے ہو؟ ہمارا وطن بہت دُور ہے"۔ لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ افغانوں کے میمنہ اور قلب لشکر میں افراتفری پھیل چکی تھی لیکن میسرہ کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھیں۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت کے ساتھ مرہٹوں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہوائیاں اور گولے پھینکتے اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو نیزہ باز ٹوٹ پڑتے۔ معظم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے اور ان میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے میمنہ پر حملہ کیا اور چند منٹ کے اندر اندر جنکوجی سندھیا کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے مل کر پے در پے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔

سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا لیکن لڑنے والوں کو گرد و غبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جب ہر وقت فریقین میں سے کسی ایک کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس ہنگامۂ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب، گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے وہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں کے لیے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی۔ مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لا چکے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیر ابھی باقی تھا۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا، جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے

اپنے جرنیلوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اب گرد و غبار کی یہ حالت تھی کہ زمین اور آسمان میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ ابدالی کے محفوظ دستے اس کے لشکر کے عقب سے ایک آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور دشمن کے میمنہ اور میسرہ کی صفیں چیرتے ہوئے اس کے عقب میں جا پہنچے۔ تازہ دم فوج کے میدان میں آ جانے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ سوا دو بجے کے قریب لشواش راؤ گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ بھاؤ نے دل برداشتہ ہو کر آخری بار پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سپہ سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے پست ہو گئے اور شام کے چار بجے کے قریب یکایک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ فاتح فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیمپ کی خندق لاشوں سے بھر دی۔ آفتاب کی واپسیں نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوعِ سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا۔ اگلی صبح کیمپ میں پناہ لینے والے بچے کھچے دستوں پر بھی یلغار کی گئی۔ لشواش راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹے بعد مر چکا تھا۔ میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان، روہیلے بلوچ اور مغل ہی نہ تھے بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت میں قیام کے دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے۔ تلواروں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جگہ جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ مرہٹہ کیمپ کا مال غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا۔ جواہرات، سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں، کوئی دو لاکھ مویشی، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ہاتھی افغانوں کے ہاتھ لگے۔

مرہٹہ فوج کے بیشتر سردار جنگ میں کام آ چکے تھے۔ اگلے دن مرہٹوں کے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

تعاقب سے واپس آنے والے جرنیل اور بڑے بڑے افسر احمد شاہ ابدالی کے سامنے باری باری اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔ دوپہر تک قریباً تمام فوج کیمپ میں جمع ہو چکی تھی لیکن معظم علی اور اس کی کمان کے چند دستے لاپتہ تھے۔ اکبر خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اسے رات کے پچھلے پہر ہلکر کے ساتھ فرار ہونے والے سپاہیوں کا تعاقب کرتے دیکھا تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اکبر خاں اس کی تلاش میں کیمپ کے اندر کئی چکر لگا چکا تھا اور نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سردار اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے، ایک روہیلہ سپاہی نے جنوب مشرق کے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "شاید وہ آرہے ہیں!"

اکبر خاں نے چونک کر دیکھا اور اسے دور حد نگاہ پر چند شتر سوار دکھائی دیئے اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "لیکن وہ گھوڑوں پر تھے، یہ کوئی اور ہیں:"

نجیب الدولہ نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ معظم علی ضرور آئے گا:" اور اکبر خاں اپنے دل میں کہہ رہا تھا: انھیں زندہ آنا چاہیئے۔ ہماری یہ شاندار فتح ان کے لیے تھی۔ ہماری اس کامیابی پر ان سے زیادہ خوش ہونے کا حق نہیں۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم تیار [illegible] ہم ان کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ کسی جگہ دشمن کے گھیرے میں پھنسے ہیں:"

نجیب الدولہ نے کہا: "دشمن میں اب لڑنے کی ہمت نہیں اور اس وقت کسی گھوڑے میں سوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی:"

"ہم پیدل جائیں گے:" اکبر خاں نے کہا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "اپنے ساتھیوں کو تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ اگر معظم علی شام تک نہ آیا تو ہم چند دستے اس کی تلاش میں بھیج دیں گے:"

تھکاوٹ کے باعث اکبر خاں کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ وہ کچھ اور کہے بغیر زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شتر سوار کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اکبر! اکبر! معظم علی آگئے!"

"کہاں ہیں وہ؟" اکبر خاں نے جلدی سے اٹھ کر سوال کیا۔

نوجوان نے اس کے جواب میں شتر سواروں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اکبر خاں بھاگ کر آگے بڑھا۔ معظم علی ایک اونٹ پر سوار تھا۔ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی قبا خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ڈھیلے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑ رکھی تھی۔

"بھائی جان بھائی!" اکبر خاں نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا، آپ زخمی تو نہیں؟"

معظم علی نے نیم بیہوشی کی حالت میں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں:"

اکبر خاں نے نکیل کھینچ کر اس کا اونٹ بٹھا دیا اور معظم علی نیچے اتر پڑا۔ اکبر خاں کو اس کی آستین پر تازہ خون کے نشان دکھائی دیئے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھائی جان آپ زخمی ہیں:"

معظم علی مسکرایا۔ "یہ معمولی خراش ہے:"

"معظم علی! معظم علی! تم کہاں تھے؟" نجیب الدولہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بہت دور نکل گیا تھا:" معظم علی نے یہ کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے نجیب الدولہ کی طرف چند قدم اٹھائے لیکن اچانک اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

اکبر، نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک سپاہی نے پانی کی چھاگل اتار کر اس کے منہ سے لگا دی۔ معظم علی نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا:

"آپ لوگوں کو مطلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔"

حافظ رحمت خاں نے اس کی آستین پھاڑ کر بازو کا زخم دیکھتے ہوئے کہا۔ "زخم معمولی ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

ایک سپاہی نے اپنا پٹکا پھاڑ کر بازو باندھ دیا اور وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

نجیب الدولہ نے کہا: "اسے اٹھا کر میرے خیمے میں لے جاؤ۔"

"نہیں" معظم علی نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "مجھے تھوڑی دیر یہیں رہنے دیجیے۔"

چند ثانیے بعد معظم علی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اب اونٹوں سے اتر کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان نجیب الدولہ کو بتا رہا تھا: "ہم نے پچاس میل تک دشمن کا پیچھا کیا تھا۔ ہمارے گھوڑے دم توڑ چکے تھے تو ہم پیدل ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اونٹ ہم نے مرہٹوں سے چھینے تھے اور ہمارے پچاس اور ساتھی پیدل واپس آ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد احمد شاہ ابدالی اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ پڑاؤ میں گشت کرتا ہوا اِدھر آ نکلا۔ "یہ کون ہے؟" اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! یہ معظم علی خاں ہے اور یہ ابھی مرہٹوں کے تعاقب سے واپس آیا ہے۔"

"اس کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"نہیں عالیجاہ! یہ بہت تھک گیا ہے۔"

شاہ ولی خاں نے کہا۔ "میں اسے میدان میں کئی بار دیکھ چکا ہوں اور اگر یہ اب تک دشمن کا پیچھا کر رہا تھا تو اس کا زندہ رہنا معجزہ ہے۔"

ابدالی نے کہا۔ "یہاں سردی ہے اسے خیمے کے اندر لے جاؤ۔"

اکبر خاں نے معظم علی کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے ابدالی کو دیکھ کر اٹھا اور باادب کھڑا ہو گیا۔

ابدالی نے اس کے خون آلود کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور تمھیں اس سے بہتر لباس کی ضرورت ہے۔" پھر اس نے اپنے ایک افسر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جاؤ اسے میرا لباس لا دو!"

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی افواج دلّی کا رخ کر رہی تھیں۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ ہلکر، داماجی گیکواڑ، نارو شنکر، مہادیوجی سندھیا اور نانا فرنویس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے۔ ابراہیم گاردی جیسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔ شمشیر بہادر اور اناجی منگیشور، جو زخمی ہو کر بھاگے تھے۔ راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنھیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی، پورا ہو چکا تھا۔ شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلانے کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لیے خاک میں مل چکے تھے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

چودھواں باب

چند دن بعد افغان افواج دلّی کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں اور شہر میں پانی پت کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں عید کا سا سماں تھا۔ اہلِ شہر کے علاوہ فوج کے افسر اور سپاہی مسجد کے اندر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر کھلے میدان میں جمع تھے۔ نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کی عزت، اقبال اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کی جا رہی تھی۔ دعا کے اختتام پر جب نمازی اٹھنے لگے تو خطیب نے بلند آواز میں کہا۔ "حضرات تھوڑی دیر ٹھہر جائیے، پانی پت کا ایک مجاہد آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے"۔ نمازی ہمہ تن گوش ہو کر منبر کی طرف دیکھنے لگے۔ معظم علی اٹھ کر منبر کے قریب پہنچا اور اس نے بلند آواز میں کہا،

"عزیزو اور بزرگو! پانی پت کی فتح بلا شبہ ہماری تاریخ کا شاندار کارنامہ ہے۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں یقیناً احمد شاہ ابدالی کو اپنا محسنِ عظیم خیال کریں گی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں اس دشمن سے نجات دلائی ہے جو ہمیں بدترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا تھا۔ ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے لیکن اس وقت ہماری دعاؤں کے سب سے زیادہ مستحق پانی پت کے وہ شہدا ہیں جنھوں نے ہماری عزت، ہماری آزادی اور ہماری بقا کے لیے اپنا خون پیش کیا ہے۔ آج ان گمنام شہیدوں کی روحیں ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ ہم

پانی پت کے میدان میں جا کر ان کی قبروں پر چراغ جلائیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہم کسی وقت بھی اس مقصد سے انحراف نہ کریں جس کے لیے وہ اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ پانی پت کے شہیدوں نے ہمیں اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے اور اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ قدرت کسی گرتی ہوئی قوم کو بار بار سنبھالا نہیں دیتی۔

ہمارے عظیم محسن احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے جب کہ ہمارے دروازے پر موت کا پہرہ تھا۔ انھوں نے ایک منتشر، مفلوک الحال اور مایوس قافلے کو اٹھا کر پھر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ہماری اگلی منزل کیا ہے۔ ہماری ماضی کی وہ کون سی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث مرہٹوں کی بربریت اور وحشت کا طوفان اٹک تک پہنچ چکا تھا اور ہم سے ہمارے حال اور ہمارے مستقبل کے مطالبات کیا ہیں؟

احمد شاہ ابدالی اپنے حصے کا کام پورا کر چکے ہیں لیکن ہمارے حصے کا کام ابھی باقی ہے۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اگر ہم نے اپنی کمزوریوں کا علاج نہ کیا تو ممکن ہے کہ چند برس کے اندر اندر ہمیں مرہٹوں سے زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بنگال میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ کرناٹک فرنگیوں کی شکارگاہ بن چکا ہے اور ان کی سازشیں دکن تک پہنچ چکی ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھر رہی ہے اور اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو یہ بعید نہیں کہ ہمارے لیے اس ملک کی زمین تنگ ہو جائے جس پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے۔

حضرات! احمد شاہ ابدالی نے ہمیں ایک خطرۂ عظیم سے نجات دلائی ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے جس کے مکینوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنا محافظ سمجھ رکھا ہو۔ ہماری بے بسی اور مظلومیت کا باعث وہ مفاد پرست

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

امراء ہیں جنھوں نے قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر دلّی کی عظیم سلطنت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ ہماری مایوسی اور بددلی کا باعث وہ محلّاتی سیاست ہے جو ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد ہو چکی ہے۔ بنگال میں مٹھی بھر انگریزوں سے ہماری شکست کا باعث وہ وطن فروش تھے۔ جنھوں نے قوم کا ساتھ چھوڑ کر اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کرلیا تھا اور اگر آپ نے بنگال کے واقعات سے سبق نہ لیا اور اسی طرح انتشار اور لامرکزیت کی لعنتوں میں مبتلا رہے تو بنگال کی تاریخ اس ملک کے ہر حصے میں دہرائی جائے گی۔ کسی قوم کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملت فروش اس کی عزت اور آزادی کے امین بن جائیں اور حریص طالع آزما اقتدار کی مسندوں پر متمکن ہو جائیں۔ گذشتہ نصف صدی کے واقعات سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ دنیا کسی کمزور قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیتا جو ملک انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہوتا ہے وہ لامحالہ انسانی بھیڑیوں کی شکارگاہ بن جاتا ہے۔

آج اس مسجد میں وہ لوگ موجود ہیں جن کی حقیقت پسندی ہمیں مستقبل کے خطرات سے بچا سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے باشعور لوگ ان جاہ پسندوں کے خلاف عوام کی قوتِ محاسبہ بیدار کریں جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری قوتِ مدافعت اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ ہم اپنے حقیر ترین دشمنوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے نہیں لڑی گئی ہے کہ ہمارے حکمران مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی مسندوں پر سو جائیں یا انھیں کچھ عرصہ اور عیش و عشرت کی محفلیں آراستہ کرنے کا موقع مل جائے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے لڑی گئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ میں اس ملک کی حکومت کے دعویداروں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ماضی سے سبق سیکھیں اور ان غلطیوں کا

اعادہ نہ کریں جن کے باعث بنگال میں ہم ایک عبرت ناک تباہی کا سامنا کر چکے ہیں اور میں عوام سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے خبردار رہیں اور جب انھیں کوئی بیرونی حملہ آور للکار رہا ہو تو وہ میدان میں آنے سے پہلے یہ تسلی کرلیں کہ ان کی صفوں میں کوئی میر جعفر تو نہیں ہے!

حضرات! مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں۔ میں نے بنگال کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میرا باپ، میرا بھائی اور میرے بہترین دوست بنگال پر قربان ہو چکے ہیں لیکن یہ بے لوث قربانیاں صرف اس لیے بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ بنگال کے عوام اس قدر بیدار نہ تھے کہ وہ محبان قوم اور وطن فروشوں کے درمیان تمیز کر سکتے۔ میں نے شہرت اور ناموری کے لیے پانی پت کی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا بلکہ میرے دل میں اگر کوئی تڑپ تھی تو یہ تھی کہ ان بھیانک تاریکیوں کو آپ کے گھروں سے دور رکھا جائے جو بنگال کے مسلمانوں پر مسلط ہو چکی ہیں اور آج میں نے آپ کے سامنے زبان کھولنے کی صرف اس لیے جرأت کی ہے کہ میں آپ کو ان خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کر لینے کی صورت میں آپ کو پیش آسکتے ہیں۔

اختتام پر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو پانی پت کی فتح سے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے صحیح نتائج پیدا کرنے کی جرأت، ہمت اور طاقت دے۔ خدا ہمارے امراء اور حکمرانوں کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ قوم کے لیے زندہ رہنا سیکھیں۔"

معظم علی کی تقریر کے اختتام پر جب لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو ایک افغان افسر نے اس سے کہا: "حضور بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں!"

احمد شاہ ابدالی منبر سے تھوڑی دور دلّی کے اکابر اور اپنے سرداروں کے درمیان کھڑے تھے۔ معظم علی ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے کہا: "میں ایک مدت سے اس

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ملک کے کسی آدمی کے منہ سے ایسی باتیں سننے کا منتظر تھا۔ اگر ہندوستان کے ہر علاقے میں تمھارے جیسے صحیح الخیال لوگ جاگ اٹھیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔" پھر انھوں نے ایک ثانیہ کے لیے شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "لیکن اگر تم کسی مرحلہ پر یہ محسوس کرو کہ اس ملک میں تمھاری خدمات کی ضرورت نہیں تو سیدھے میرے پاس پہنچ جاؤ۔ وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"

○

اگلے دن معظم علی ظہر کی نماز ادا کر کے جامع مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے نجیب الدولہ کی فوج کا ایک سپاہی دکھائی دیا۔

"آپ کو امیر الامراء نے یاد فرمایا ہے!" سپاہی نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت فوج کے پڑاؤ میں ہیں۔ چلیے!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پڑاؤ کے ایک عالیشان خیمے کے اندر نجیب الدولہ کے سامنے کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کل مسجد میں تمھارے منہ سے میرے دل کی آواز نکل رہی تھی لیکن شجاع الدولہ تمھاری تقریر سے بہت پریشان ہیں۔ وہ صبح مجھ سے ملے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سب ان کے متعلق تھا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ یہ نوجوان لکھنؤ پہنچ کر میرے لیے سردردی کا باعث بنے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی تم پر زیادہ خوش نہ تھے لیکن کل تمھاری تقریر نے انھیں بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔"

"میں تمھاری حق گوئی کا معترف ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شجاع الدولہ کو ناراض

کر کے تمھارا لکھنؤ ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "لکھنؤ میرے سفر کی آخری منزل نہیں اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ وہاں رہ کر میری زبان میرے ضمیر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو میں اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنے میں تکلیف محسوس نہیں کروں گا۔"

نجیب الدولہ نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا۔ "میں نے شجاع الدولہ کو سمجھا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تم کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کسی وقت تم کو لکھنؤ کی آب و ہوا راس نہ آئے تو تمھارے لیے دلی کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس وقت بھی تم پسند کرو تو میں تم کو فوج میں بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ابھی دلی کے حالات اس قابل نہیں کہ میرے دل میں ملازمت کا شوق پیدا ہوا۔ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ میں یہاں آ کر کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو آپ مجھے ایک رضاکار کی حیثیت میں یہاں موجود پائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد دلی کے حالات کیا ہوں گے۔ مجھے آپ کے تدبر اور فراست پر اعتماد ہے لیکن جب تک دلی کے تخت پر کوئی اولوالعزم حکمران نہیں بیٹھتا میرے نزدیک دلی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایسی عظیم الشان فتح کے بعد اس ملک کے اکابر قوم کا مستقبل کسی ایسے حکمران کو نہیں سونپ سکے جس کی سیرت اور کردار رعایا کی آزادی اور بقا کی ضمانت دے سکتا ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قابلیت کے بغیر کوئی شخص اپنے سر پر تاج پہننے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہم اپنے نام نہاد حکمرانوں کی نااہلیت کے باعث بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن کاش ہمارا وہ محسن جس نے ہمیں مرہٹوں کی جارحیت سے نجات دلائی ہے ہمیں یہ مژدہ بھی سنا سکتا کہ دلی کے تخت کے لیے ایک انسان کی ضرورت ہے اور اس ملک

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کے امراء کا یہ فرض ہے کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو قوم کی سیادت سونپ دیں۔ خدا کرے دلی کی حکومت کے نئے دعویدار سے آپ کی توقعات درست ثابت ہوں لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح معنوں میں حکمران ثابت ہوگا یا صرف یہاں کے بادشاہ گروں کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تمھارا ہم خیال تھا لیکن مغل امراء کا یہ مطالبہ تھا کہ دلی کے تخت پر کسی جائز وارث کو بٹھایا جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا "میرے نزدیک صرف وہ بات جائز ہوتی ہے جو صحیح بھی ہو۔ شاہ عالم کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ دلی کی سازشوں سے خوفزدہ ہو کر کہیں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جن امراء نے اسے تخت پر بٹھانے کے لیے بہت زیادہ زور دیا ہے، وہ صرف اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنے مقتول باپ سے زیادہ کمزور ثابت ہوگا۔ میرے لیے اگر کوئی بات اطمینان بخش ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ دلی میں احمد شاہ ابدالی کے نمائندے ہوں گے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ نیا شہنشاہ کسی دن آپ سے منہ پھیر کر ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن جائے جو اس سے پیشتر کئی کھلونے توڑ چکے ہیں۔"

"تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ شاہ عالم ایک ناکام حکمران ثابت ہوگا؟"

"میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے اور اس کی بادشاہت ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر ہوگی۔ مجھے جلا وطنی کی حالت میں اس کی بےبسی کا احساس ہے لیکن مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر شاید وہ زیادہ بےبس ثابت ہوگا۔"

نجیب الدولہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم کب واپس جا رہے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا "میں صرف اس امید پر ٹھہر گیا تھا کہ شاید احمد شاہ ابدالی واپس جانے کا خیال ترک کر دیں اور جنوب کی طرف پیشقدمی کریں۔ میں انھیں مہاراشٹر کے

میدانوں میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب میں دو تین دن تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

نجیب الدولہ نے کہا۔ "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ اگر افغان سردار مخالفت نہ کرتے تو شاید اس وقت تک ہمارے گھوڑے دریائے نربدا کا پانی پی رہے ہوتے لیکن میں تمھیں پھر ایک بار یہ مشورہ دوں گا کہ تم لکھنؤ جا کر محتاط رہو۔ شجاع الدولہ ایک منتقم المزاج آدمی ہے۔ اگر اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے تو وہ تم سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے تلاش کرے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے خیالات سے متاثر ہو کر وہ قوم کی بھلائی کا کوئی کام کر سکے۔"

معظم علی مسکرایا۔ "قوم کی بھلائی کے لیے میں ایک حقیر ترین انسان کے پاؤں پر سر رکھنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

"اور تمھیں شاہ عالم کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار میں بھی محتاط رہنا چاہیئے۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے ہم خیال امراء ان کے بہت زیادہ طرف دار ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ انھیں ایک کارآمد کھلونا سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نجیب الدولہ سے ملاقات کے بعد پڑاؤ میں اپنے خیمے کے قریب پہنچا تو اکبر خاں باہر دھوپ میں بیٹھا ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ معظم علی کو دیکھتے ہی اکبر خاں نے اٹھ کر کہا۔ "بھائی جان یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

معظم علی اجنبی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اجنبی نے کہا۔ "میرا نام اسد خاں ہے۔ میں میسور سے حیدر علی کا ایک خاص پیغام لے کر احمد شاہ ابدالی کے پاس آیا تھا۔ کل مسجد میں میں نے آپ کی تقریر سنی تو میرے دل میں آپ سے متعارف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔"

"آپ احمد شاہ ابدالی سے مل چکے ہیں؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"جی ہاں! اور دو تین دن تک میں واپس جا رہا ہوں۔ کل آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے فوج کے ایک سپاہی سے آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ آپ کو کسی دن میسور آنے کی دعوت دوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق آپ جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ انشاءاللہ میسور میں پورے ہوں گے۔ حیدر علی اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کو ایک طرف مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے اور دوسری طرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلانا چاہتا ہے اور اس نے میسور کے دروازے ہر صحیح الخیال مسلمان کے لیے کھول دیئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ اس کے متعلق یہ سنیں گے کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی سرگزشت یہ ہے کہ میں کرناٹک کی فوج میں ملازم تھا اور محمد علی والا جاہ کی فوج کے افسروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ جب انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو محمد علی نے مدراس کے گورنر کی خواہش پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد کے لیے چند دستے کلکتہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ان دستوں کی کمان کے لیے منتخب کیا گیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر مجھے بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی لیکن چھ ماہ قید کاٹنے کے بعد مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا اور میں سیدھا سرنگا پٹم پہنچ گیا۔ حیدر علی کی سفارش سے مجھے میسور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ میسور کے راجہ کی فوج کا یہ نڈر سپاہی کسی دن جنوبی ہند کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بنے گا۔ اگر آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں جو ہندوستان کے بے بس اور مایوس مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھا سکے تو آپ کسی دن سرنگا پٹم ضرور آیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ کو ان کے سامنے جا کر یہ بتلانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ آپ کون ہیں۔ ان کی مردم شناس نگاہیں آپ کے چہرے

سے آپ کے دل کا حال معلوم کر لیں گی۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میں حیدر علی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں لیکن سردست میں سرنگا پٹم جانے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک مجھے حیدر آباد جانا پڑے اور اگر موقع ملا تو شاید میسور بھی دیکھ سکوں۔ بہرحال مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی ہے۔"

○

ایک دوپہر فرحت اپنے دو ماہ کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور عابدہ اس کے قریب مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ صابر ہانپتا ہوا آیا اور اس نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی۔ بی بی جی! خاں صاحب آگئے ہیں۔"

فرحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور عابدہ الحمدللہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔

چند ثانیے بعد سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ فرحت نے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ معظم علی "السلام علیکم" کہہ کر کمرے میں داخل ہوا اور فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر یہ دعائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگیں اور اس نے کہا: "آپ کو فتح مبارک ہو!"

عابدہ سجدے سے سر اٹھا کر معظم علی کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ اسے سلام کر کے بچے کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھی اور اس نے بچے کو بستر سے اٹھا کر معظم علی کی گود میں رکھ دیا۔ "تمھیں سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے!" اس نے کہا۔

معظم علی نے شرماتے ہوئے سوال کیا۔ "چچی جان اس کا نام کیا رکھا ہے؟"

"بیٹا ہم ہر روز اسے ایک نئے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ شیر علی مصر تھے کہ اس کا نام صدیق علی رکھ دیا جائے لیکن فرحت کہتی تھی کہ تمھارے آنے تک انتظار کر لیا جائے۔"

"صدیق علی اچھا نام ہے چچی جان! کیوں فرحت تمھارا کیا خیال ہے؟"

(c) ketabton.com: The Digital Library

فرحت ابھی تک مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

"مجھے اس کے لیے ہر نام اچھا لگتا ہے۔"

عابدہ نے کہا: "بیٹا میں تمھارے لیے کھانا لاتی ہوں!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں چچی جان کھانا میں راستے میں کھا چکا ہوں، آپ تشریف رکھیں۔ فرحت تم بھی بیٹھ جاؤ!"

ماں اور بیٹی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

عابدہ نے کہا: "بیٹا اکبر خاں ملا تھا؟"

"چچی جان اکبر خاں میرے ساتھ تھا۔ جنگ میں اس کی بہادری کے قصے دور دور تک مشہور ہو چکے ہیں!"

فرحت نے کہا۔ "پچھلے مہینے حیدر آباد سے شیخ فخرالدین کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ اکبر خاں کو ساتھ لے کر حیدر آباد ضرور آئیں!"

معظم علی نے کہا: "اب چند مہینے میرا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اگلے سال میں وہاں جاؤں لیکن آپ اور چچی جان میرے ساتھ ہوں گی۔"

عابدہ نے کہا: "بیٹا جب پانی پت میں تمھاری فتح کی خبر آئی تھی تو لکھنؤ میں چراغاں کیا گیا تھا۔ صابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ سب سے زیادہ چراغ ہمارے مکان میں جلنے چاہئیں؛ جشن کی رات ہمارے مکان کا کوئی گوشہ چراغوں سے خالی نہ تھا۔ پھر شہر میں ایک رات چراغ جلائے گئے تھے لیکن صابر نے پوری سات راتیں چراغاں کیا۔ اب تم اطمینان سے ہمیں جنگ کے واقعات سناؤ!"

معظم علی نے پانی پت کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو فرحت نے کہا: "آپ کی باتیں سننے کے لیے صابر ہم سب سے زیادہ بیقرار ہے۔ آپ ذرا اونچی آواز میں باتیں کریں مجھے یقین ہے کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے!"

www.allurdu.com

معظم علی مسکرایا۔ "صابر اندر آجاؤ!"

صابر کمرے میں داخل ہوا اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ پھر معظم علی جنگ کے واقعات سنا رہا تھا اور صابر کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ پانی پت کے آخری معرکے کی تفصیلات سننے کے بعد صابر اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا صحن میں جا پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے نوکر اور محلے کے لوگ اس کے گرد جمع تھے اور وہ انھیں اپنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ معظم علی اور اکبر خاں کے بہادرانہ کارنامے سنا رہا تھا۔

○

پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح لکھنؤ کے مسلمان عوام میں بھی ایک نیا ولولہ بیدار ہو چکا تھا۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر امراء کے محلات تک ان بہادروں کی جوانمردی کی داستانیں زبان زدِ عام تھیں جو مرہٹوں کی عظیم ترین طاقت کو پامال کر چکے تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد لکھنؤ واپس آنے والے سپاہی اپنے ساتھ بیشمار اولوالعزم مجاہدوں کے کارناموں کی روح پرور داستانیں لائے تھے اور معظم علی، جسے لکھنؤ کے لوگ کچھ مدت قبل صرف ایک کامیاب اور خوشحال تاجر کی حیثیت سے جانتے تھے، اب ان کی نگاہوں میں ایک قومی ہیرو بن چکا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو عوام اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے۔ اس کے ساتھ ہمکلام ہونے یا مصافحہ کرنے میں ایک خوشی محسوس کرتے۔ امیر لوگ اسے دعوت دینے پر اصرار کرتے۔ طبقۂ اعلیٰ کی خواتین اس کے گھر آکر فرحت کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنا اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتیں۔ معظم علی ان رسمی ملاقاتوں اور دعوتوں سے اجتناب کرتا لیکن کبھی لوگوں کی گرمجوشی میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر محفل میں اس سے پانی پت کی جنگ کی تفصیلات سنانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے عقیدت مندوں کو مختصر سا جواب دے کر ٹالنے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی کوشش کرتا لیکن کبھی کبھی وہ اس انداز سے گفتگو کرتا کہ سننے والوں کی نگاہوں کے سامنے پانی پت کے میدان کی تمام تفصیلات آجاتیں۔

ایک دن اودھ کی فوج کے ایک بڑے افسر نے اسے اپنے ہاں دعوت دی۔ شہر کے چیدہ چیدہ لوگ اور فوج کے کئی افسر اس دعوت میں شریک تھے۔ جب پانی پت کی جنگ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو شہر کے ایک رئیس نے سوال کیا: "جناب آپ کے خیال میں احمد شاہ ابدالی اور ان کی افواج کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ حصہ کن لوگوں کا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں جنگ میں شریک ہونے والے ہر سپاہی کو اس فتح میں یکساں حصہ دار سمجھتا ہوں۔"

دوسرے آدمی نے سوال کیا: "لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ روہیلکھنڈ کے سپاہیوں کی بہت تعریف کرتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "روہیلکھنڈ کے جوانوں نے پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے ہر سپاہی کو متاثر کیا ہے اور میں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ کاش ہندوستان کے باقی امراء کے پاس بھی ایسے سپاہی ہوتے۔"

فوج کے ایک افسر نے کہا: "معاف کیجیے! روہیلوں کے ساتھ آپ کی محبت کی وجہ یہ تو نہیں کہ ان کے چند دستے آپ کی کمان میں تھے؟"

معظم علی نے برہم ہو کر کہا: "اگر میں اودھ کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تو بھی آپ اسی طرح میرے منہ سے روہیلوں کی تعریف سنتے۔ میں نے پانی پت کے میدان میں جو کچھ دیکھا ہے ایک سپاہی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔"

فوجی افسر نے پھر کہا: "لیکن جناب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک سپاہی کی نظر سے دیکھنے کے بعد آپ نے اودھ کی فوج کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں،

روہیلہ سپاہی اودھ کے سپاہیوں سے بہتر ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلہ سپاہیوں کی تعریف کرنے سے اودھ والوں کی توہین ہوتی ہے تو میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کروں گا۔" افسر خاموش ہو گیا اور معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "اگر آپ حضرات برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ روہیلکھنڈ کا ہر جوان اس جنگ کو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ سمجھتا تھا لیکن وہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اس جنگ کو صرف اپنے امراء کی جنگ سمجھتے تھے اور میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اس محفل میں مجھے ان امراء کا تذکرہ چھیڑنے پر مجبور نہ کریں جو آخری وقت اس کوشش میں تھے کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے اور وہ لڑے بغیر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔"

ایک امیر زادے نے کہا: "لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں سکتے کہ پانی پت کی فتح کے لیے ہمیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ہزاروں سپاہیوں کے نقصان کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ افغان سرداروں نے دلی سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر نجیب الدولہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے ساتھ قوت آزمائی پر مصر نہ ہوتے تو مرہٹوں سے آئندہ پرامن رہنے کا وعدہ لیا جا سکتا تھا اور ہماری متحدہ افواج ایک طرف کلکتہ اور دوسری طرف مدراس تک پیشقدمی کر کے اس ملک کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا سکتی تھیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ نیام سے تلوار نکالے بغیر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے دشمن کا سر قلم ہو چکا ہے۔ مرہٹوں کو فیصلہ کن معرکے سے پہلے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ ہمیں لڑائی کے بغیر فتح حاصل ہو چکی ہے تو یہ ایک بدترین حماقت ہوتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مرہٹے کچھ عرصہ بعد زیادہ تیاریوں کے ساتھ شمال کا رخ کرتے اور ہمیں ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ہولناک جنگ لڑنا پڑتی۔ مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں ہمارے ملک کے وہ سیاست دان تھے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے تدبر اور ذہانت کے بل بوتے پر مرہٹوں کی جارحیت کو اپنی سرحدوں سے دور رکھ سکتے ہیں لیکن نجیب الدولہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں، وہ جانتے تھے کہ مرہٹوں کو ایک فیصلہ کن جنگ ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ آپ میں سے کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ مرہٹے جو گذشتہ چند برس میں سینکڑوں شہر اور ہزاروں بستیاں تاخت و تاراج کر چکے ہیں، پانی پت کے میدان میں پہنچنے کے بعد اچانک جنگ سے متنفر ہو گئے تھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر انھیں وہاں سے بچ نکلنے کا موقع دے دیا جاتا تو وہ واپس جاتے جاتے دلی سے دکن تک راستے کی ہر بستی کو تباہی و بربادی کا پیغام نہ دیتے اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیدھے گھر جانے کی بجائے آگرہ اور لکھنؤ جیسے شہروں کو اپنے راستے کی منزلیں بنانے کی کوشش نہ کرتے! مجھے افسوس ہے کہ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو اس سیلاب کا صحیح اندازہ ہے جو پونا سے نکل کر پانی پت تک پہنچ گیا تھا۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے اس سیلاب کے راستے میں ایک عظیم پہاڑ کھڑا کر دیا ورنہ اس ملک کے جو امراء اپنی فراست اور تدبر پر فخر کرتے ہیں ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی معمولی لہروں کا بھی مقابلہ کر سکتے۔ احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب اگر ہم انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں اور ہمارے امراء انفرادی خودکشی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے متحد اور منظم ہو کر اجتماعی بقا کے لیے جدوجہد کریں تو ہم کسی دقت کا سامنا کیے بغیر اس ملک کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچا سکتے ہیں۔

قوم کی موت و حیات کے مسائل سے ہماری قسمت کے ناخداؤں کی بے حسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انگریز بنگال کی آزادی پر چھاپہ مارتے ہیں تو ان میں سے

کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ جو بے رحم ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹ چکے ہیں وہ کسی دن ان کی شہ رگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر جاٹ اور مرہٹے دلی یا روہیلکھنڈ کے علاقوں میں تباہی مچاتے ہیں تو اودھ، دکن، لاہور یا ملتان کے صوبیدار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آگ ابھی تک ان کے اپنے گھر کی چار دیواری سے دور ہے۔ اسی طرح جب دکن یا اودھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دوسروں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے چند امراء ایک اجتماعی خطرہ سے خوف زدہ ہو کر ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے اور اس اتحاد کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا ہے۔ اب اگر ہم فرنگی تاجروں کو اس ملک سے نکال نہ سکے یا اگر ہم نے مرہٹوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو ہماری اس ناکامی کا باعث ہمارے اکابر کی نااہلیت اور کوتاہی ہوگی۔

احمد شاہ ابدالی کے لیے ہر سانس کے ساتھ میرے دل سے ایک دعا نکلتی رہے گی۔ انھوں نے مجھے ایک باغوت اور باوقار قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع عطا کیا ہے لیکن اس احسان عظیم کے بعد میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ آیئے اب آپ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر بھی پہرہ دیجیے اور اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ مرہٹے جو پانی پت کی جنگ کے بعد نیم جان ہو چکے ہیں۔ کہیں دوبارہ اٹھ کر ہمارے مقابلے پر نہ آجائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی مرکزیت برقرار رکھنے کے لیے ایک برائے نام شہنشاہ کی ضرورت ہے اور جس شخص کو دلی کا تخت سونپا جا رہا ہے اسے امراء کی سازشوں یا دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی آپ کے پہرے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں ان لوگوں سے کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں جو اپنے آپ کو قوم کی کشتی کا ناخدا سمجھتے ہیں اور میں ان سے یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ خدا کے لیے ماضی کے واقعات سے سبق حاصل کرو۔ اگر تمہاری کوتاہ اندیشی، عافیت پسندی اور سہل انگاری کے باعث قوم

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی نیّا ڈوب گئی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاؤ گے۔

آپ میں سے کسی کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ میں پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے روہیلہ جانبازوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں روہیلکھنڈ کا دوست ہوں نہ اودھ کا دشمن۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں میں ان سب کو اپنے ملّی وجود کا ایک حصّہ سمجھتا ہوں۔ پانی پت کی جنگ میں شہید ہونے والے افغان، مغل، بلوچ اور ہندی مسلمان سب میرے محسن تھے۔ ان کا مقدس خون میری عزت، میری آزادی اور میری سربلندی کے لیے بہا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس خون کی روشنائی سے میرے اور میری قوم کے مستقبل کی تاریخ کے بہترین صفحات لکھے جائیں۔"

جب یہ محفل برخاست ہو رہی تھی تو لکھنؤ کا ایک عمر رسیدہ آدمی معظم علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میزبان کے گھر سے باہر نکلا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچایا جائے گا؟"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا "خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ تمام باتیں شجاع الدولہ کے لیے ہی کہی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیک اقدام قوم کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو سکتا ہے اور جن کی کوتاہیوں سے لاکھوں انسانوں کے لیے تباہی اور بربادی کے راستے کھل سکتے ہیں۔"

⊙

لکھنؤ میں معظم علی کی بڑھتی ہوئی عزت اور شہرت کے ساتھ اس کے خلاف وہ عیب جُو اور حاسد لوگ بھی بیدار ہو چکے تھے جو کسی انسان کی تعریف کو اپنی مذمت کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اُمرا جو ابتدا میں اس کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ اب اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ مسند نشینوں اور کورنش بجا لانے والوں یا خواجوں اور خواجہ سراؤں کی دنیا میں ایک حق گو اور بیباک انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ابتدا میں معظم علی اودھ کی

حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے اجتناب کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات کی تلخی بڑھتی گئی۔ تجارت کا رہا سہا کاروبار عملی طور پر شیر علی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت قوم کے مستقبل پر سوچنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر یہ خیال بری طرح حاوی ہو رہا تھا کہ ملک کے امراء اگر نئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو بنگال کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی جا سکتی ہے اور کرناٹک میں ان کی سازشوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ مرہٹوں کے متعلق بھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ انھیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیئے ادھر پنجاب میں سکھوں کے حوصلے مسلمانوں کے لیے ایک نیا خطرہ بن چکے تھے اور معظم علی کے نزدیک ہر الجھن، ہر پریشانی کا واحد علاج یہ تھا کہ سلطنت کے تمام صوبیدار اور امراء منظم اور متحد ہو کر قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل پر غور کریں اور ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عوام میں ایک اجتماعی احساس بیدار کریں۔ پانی پت کی جنگ اس کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی لیکن یہ تلخ حقیقت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں کہ امراء کی بے حسی بتدریج عوام کے اٹھتے ہوئے حوصلوں اور ولولوں پر غالب آ رہی ہے۔ وہ لکھنؤ کے امراء سے ملتا اور انھیں یہ سمجھاتا کہ اگر ہم نے ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ قوم پھر ایک بار مایوسی اور بے حسی کے دلدل میں جا گرے گی۔ اگر ہمارے اکابر اپنی سیاسی سودا بازیوں اور محلاتی سازشوں پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کے جذبۂ مدافعت پر اعتماد کریں تو ہم چند ماہ کے اندر اندر مٹھی بھر انگریزوں کو خلیج بنگال کے گہرے پانیوں کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ مرہٹوں کے لیے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر صرف اودھ اور دکن کی حکومتیں صرف چند ہفتوں کے لیے اتحاد کر لیں تو جنوبی ہندوستان کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی جا سکتی ہے۔

معظم علی کبھی آدھی آدھی رات تک گھر میں بیٹھ کر دکن، لاہور، ملتان اور سرہند

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کے صوبیداروں، دلی کے وزیروں اور امیروں اور روہیلکھنڈ کے سرداروں کے نام اس قسم کے خطوط لکھتا :-

"ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی بار بار ہماری اعانت کے لیے نہیں آئیں گے۔ اگر آپ متحد ہو جائیں تو گئی گزری حالت میں بھی اس ملک کی کوئی طاقت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ آپ اس ملک کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے محافظ ہیں۔ اگر آپ نے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو آپ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے؟ پانی پت کی فتح کے بعد اس ملک کے مایوس اور بددل مسلمانوں میں جو حوصلے اور ولولے بیدار ہوئے تھے وہ اب سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حال سے مایوس اور مستقبل سے بے پروا ہو جائیں۔ ہماری سب سے بڑی بیماری لامرکزیت ہے۔ اگر آپ متحد اور منظم ہو جائیں تو دلی کے تخت کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جا سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی جو ابھی تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے قوم کی ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا تو خدا کے واسطے سل[illegible] بوجھ اٹھانے کے لیے کسی ایسے آدمی کو آگے لانے کی کوشش کیجیے جس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جا سکے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ایک قوم کا مستقبل کسی نااہل حکمران کی ذاتی خواہشات پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی عزت، آزادی اور بقا کا واسطہ دے کر آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے فرائض کا احساس کریں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے جو قوم کی آزادی کے پاسبان ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہیں تو میری آخری

درخواست یہ ہے کہ آپ قوم کے راستے سے ہٹ جائیں اور ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیں جو قوم کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔"

○

ایک دن معظم علی اپنے دفتر میں بیٹھا انتہائی انہماک کی حالت میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اکبر خاں کمرے میں داخل ہوا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صابر دروازے پر کھڑا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خاں دیر تک چپ چاپ بیٹھا ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی لکھا ہوا کاغذ رکھ کر دوسرا کاغذ اٹھانے لگا تو اچانک اس کی نگاہ اکبر خاں پر جا پڑی۔

"بھائی جان، السلام علیکم!" اکبر خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

معظم علی "وعلیکم السلام" کہہ کر اٹھا اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد بغلگیر ہو کر بولا۔ "تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"میں ابھی آیا ہوں بھائی جان! آپ اطمینان سے اپنا کام ختم کر لیجیے۔"

"بیٹھو، میرا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

وہ بیٹھ گئے اور اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بھائی جان ابھی صابر مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ دن رات لکھتے رہتے ہیں اور اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ بھابی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کئی دنوں سے تمھارے ہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنا عرصہ کہاں تھے۔ کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو بھیج دی ہوتی!"

اکبر خاں نے جواب دیا: "بھائی جان یقین کیجیے کہ میں ہر روز آپ کی خدمت میں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

حاضر ہونے کا ارادہ کیا کرتا تھا۔ دو ماہ قبل ہمارے علاقے کا ایک آدمی لکھنؤ آرہا تھا اور میں نے اسے ایک خط دیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے ملا اور اس نے بتایا کہ گھر سے نکلنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا تھا اور میں لکھنؤ کی بجائے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے آگرہ چلا گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا۔ "شیخ فخر الدین ہر خط میں تمھارے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ میں نے پرسوں ہی انھیں لکھا ہے کہ اکبر خاں نے مدت سے کوئی اطلاع نہیں بھیجی اور عنقریب اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔ شیخ صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ مُصر ہیں کہ میں حیدرآباد آؤں تو تمھیں ساتھ لے کر آؤں۔"

"وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں بھی انھیں بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ اگر آپ حیدرآباد گئے تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔"

معظم علی نے کہا: "اب معلوم نہیں کہ مجھے کہاں کہاں جانا پڑے۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ میں زیادہ عرصہ لکھنؤ میں نہیں رہ سکوں گا۔ نواب شجاع الدولہ کے خوشامدی اور جی حضوری مجھ سے بہت خفا ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ایک بڑے اہلکار نے مجھ سے گلہ کیا تھا کہ میں لکھنؤ میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان! میں نجیب الدولہ کی دعوت پر پچھلے مہینے چند دنوں کے لیے دلی گیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ شجاع الدولہ آپ جیسے حق گو آدمی کا زیادہ عرصہ لکھنؤ میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے انھیں کوئی چٹھی لکھی تھی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "ان دنوں میرا سب سے بڑا مشغلہ اس ملک کے اکابر کے نام خطوط لکھنا ہے اور اس وقت بھی میں میر نظام علی کے نام ایک خط لکھ رہا تھا۔"

"میر نظام علی کو آپ نے کیا لکھا ہے؟"

"میں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی تازہ فتوحات پر اسے مبارک باد دی ہے۔ تمھیں

معلوم ہے کہ وہ مرہٹوں سے حیدرآباد کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے چکا ہے۔ شیخ فخر الدین کی رائے اس کے متعلق اچھی نہ تھی لیکن پچھلے خط میں انھوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ میں نے نظام کو لکھا ہے کہ آپ اس ملک کے امرا کو اجتماعی خطرے کے مقابلے میں متحد اور منظم کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ تم یہ خط پڑھ سکتے ہو۔" معظم علی نے یہ کہہ کر لکھے ہوئے کاغذ میز پر سے اٹھائے اور اکبر خاں کے ہاتھ میں دے دیئے۔

اکبر خاں نے خط پڑھنے کے بعد معظم علی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا: "بھائی جان! آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے اور چچا شیر علی کہاں ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "پانی پت کی جنگ سے لوٹنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ بیشتر کام چچا شیر علی نے سنبھال رکھا ہے اور وہ چند دن سے فیض آباد گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج یا کل آجائیں گے۔"

صابر ایک کم سن بچہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور اسے اکبر خاں کی گود میں رکھتے ہوئے بولا: "بھلا یہ کون ہے؟"

اکبر خاں مسکرایا اور اس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرا ننھا منا لاڈلا بھتیجا ہے اور کسی دن یہ اس ملک کی عظیم ترین فوج کا سپہ سالار بنے گا۔"

پانچ دن بعد معظم علی، اکبر خاں اور شیر علی ایک کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اچانک باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد دلاور خاں انتہائی بدحواسی کی حالت میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا: "جناب شہر کا کوتوال آپ سے ملنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی ہیں۔"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا: "کوتوال سے پوچھو اگر انھیں ناشتا کرنا ہو تو یہاں تشریف لے آئیں ورنہ انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو اور کہو میں ابھی آتا ہوں۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

دلاور خاں نے کہا۔ "جناب میں نے کہا تھا کہ آپ ناشتہ کر رہے ہیں لیکن وہ فوراً آپ سے ملنے پر مُصر تھے۔"

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔ "جاؤ اسے کہہ دو میں ابھی آتا ہوں اور میرے لیے ایک گھوڑے پر زین بھی ڈال دو!"

دلاور خاں کمرے سے باہر نکل گیا تو معظم علی نے کہا "اکبر معلوم ہوتا ہے کہ مجھے شجاع الدولہ نے یاد کیا ہے۔ اگر مجھے کسی وجہ سے دیر لگ جائے تو تم اپنی بھابی اور ان کی والدہ کو حیدر آباد پہنچا دینا۔ میں انشاء اللہ وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کئی ہفتوں سے شجاع الدولہ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو آپ کو شجاع الدولہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ حیدر آباد کی نسبت میرا گھر یہاں سے نزدیک ہے اور ہم کسی وقت کے بغیر کوتوال اور اس کے آدمیوں کو کسی کوٹھڑی میں بند کر کے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ آدمی مجھے گرفتار کرنے کی نیت سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی میرا قید ہونے کا ارادہ ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں!" معظم علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم یہیں رہو۔ تمھیں اس کمرے سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

معظم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور شیر علی جو سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا اپنے حلق میں اٹکا ہوا لقمہ نگلنے کے بعد شکایت کے لہجے میں بولا:

"انھوں نے کبھی میرا کہا نہیں مانا۔ میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو لوگ قوم اور ملک کے خیر خواہ بن کر آپ کے پاس آتے ہیں ان میں سے آدھے حکومت کے جاسوس ہوتے ہیں

لیکن خدا معلوم پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد انھیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بھری محفل میں حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔"

اکبر خاں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد شیر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "چچا جان پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے لاکھوں انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہو گئی ہے اور بھائی جان کے منہ سے ان لاکھوں انسانوں کے دل کی دبی ہوئی آواز نکلتی ہے۔"

"لیکن اب کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں چچا جان، آپ پریشان نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں شجاع الدولہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

صحن میں مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی کوتوال کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔

اکبر خاں نے شیر علی سے کہا۔ "چچا جان میں ابھی آتا ہوں!"

شیر علی نے کہا۔ "خدا کے لیے معظم علی کو یہ ضرور سمجھاؤ کہ شجاع الدولہ ایک تند مزاج آدمی ہے وہ اس کے ساتھ بات کرنے میں احتیاط کریں۔"

"چچا آپ اطمینان رکھیں۔" اکبر یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اکبر مجھے نواب وزیر اودھ نے کسی ضروری کام سے بلایا ہے۔ میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کوتوال اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کا رخ کر رہا تھا۔

○

معظم علی نواب شجاع الدولہ کی مسند کے سامنے کھڑا تھا اور مسند سے آگے دائیں بائیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

دو قطاروں میں چند امرا اور عہدہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے چند ثانیہ اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ "مجھے تمھارے دو خط ملے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمھیں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے عہدہ دار کے نام خط لکھنے کا شوق ہے۔ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہمیں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے تمھارے نیک مشوروں کی ضرورت ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کی قسمت وابستہ ہے اور آپ کا صحیح قدم قوم کے لیے خیر و برکت اور آپ کی معمولی کوتاہی اس کے لیے تباہی کا باعث ہو سکتی ہے تو میں آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔"

"لیکن تمھیں ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم صرف اپنی تجارت سے سروکار رکھو اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو کہ قدرت نے سلطنت کا سارا بوجھ تمھاری گردن پر لاد دیا ہے؟ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ جو لوگ بنگال کو تباہی کے راستے پر ڈال کر وہاں سے بھاگے ہیں وہ یہاں آ کر ہمارے لیے کوئی فتنہ پیدا کریں۔"

معظم علی ایک مبلّغ کا جذبہ لے کر شجاع الدولہ کے دربار میں داخل ہوا تھا لیکن یہ الفاظ اسے چابک کی طرح لگے اور اس نے جواب دیا۔ "معاف کیجیے مجھے اس سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر اقتدار کی مسندیں آراستہ کرنے والے امرا اپنے آپ کو کبھی مرہٹوں، کبھی جاٹوں، کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز آپ کے کانوں کے لیے غیر مانوس ہوگی لیکن اقتدار کی مسند کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر جان دینے والوں کا مذاق اڑائے۔ بنگال میں میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی ہزاروں خوشیاں اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر قربان کر چکا ہوں۔

میرا باپ، میرا بھائی، میرے عزیز اور میرے دوست سراج الدولہ کے جھنڈے تلے قربان ہو چکے ہیں۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے یہ جرم کیا ہے کہ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ابھی تک میری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں جو قوم کے کام آ سکتے ہیں تو میں ایک رضا کار کی حیثیت میں پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "پانی پت کی جنگ میں اس ملک کے ہزاروں انسان حصہ لے چکے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ حکومت کے خلاف باغیانہ تقریریں کرے۔ تم ہمارے خلاف کئی مہینوں سے نفرت پھیلا رہے ہو۔ تم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کے خلاف انتہائی توہین آمیز باتیں کہی ہیں۔ تم نے دلّی میں احمد شاہ ابدالی کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے کہ پانی پت کی جنگ میں اودھ کی افواج کی حیثیت تماشائیوں سے زیادہ نہ تھی۔ ہم تمھیں روہیلوں کی طرف داری سے منع نہیں کر سکتے لیکن تمھیں نجیب الدولہ یا حافظ رحمت خاں کے اشاروں پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لکھنؤ میں تمھاری خدمات کا احساس نہ ہوتا تو ہم ایک ثانیہ کے لیے بھی تمھارا یہاں رہنا گوارا نہ کرتے۔"

معظم علی نے ایک ثانیہ کے لیے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھا اور پھر شجاع الدولہ کی آنکھوں میں ڈال کر جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میرے دوستوں نے میرے متعلق آپ کو کیسی اطلاعات پہنچائی ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ میں اس ملک کے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہوں اور کوئی باشعور آدمی ان حالات سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسی قوم کے فرد کی حیثیت میں کھڑا ہوں جس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے اور آپ اس ملک کے ان چند انسانوں میں سے ایک ہیں جو اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ پانی پت

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کی جنگ کے بعد قدرت نے ہمیں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو قدرت شاید ہماری اس کوتاہی کو قابل معافی نہ سمجھے۔ اگر ہمارے امراء اور صوبیداروں نے متحد اور منظم ہو کر مرکز کو مضبوط نہ کیا تو مرہٹوں کو دوبارہ سر اٹھانے میں دیر نہیں لگے گی اور ہمارے اکابر کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ جب کوئی نیا طوفان آئے گا تو قدرت ان کی اعانت کے لیے کسی اور احمد شاہ ابدالی کو بھیج دے گی۔ مرہٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اس وقت ہمارے لیے انگریز ہیں لیکن ہماری اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے امراء نے بنگال کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ہم اس جنگل میں رہتے ہیں جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور میرے چیخنے اور چلانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں لکھنؤ سے اس آگ کے شعلے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس اژدہا کی پھنکاریں سن رہا ہوں جو بنگال کو ہڑپ کر چکا ہے۔ میں ان بھیڑیوں کی چیخیں سن رہا ہوں جو ایک بار پھر مہاراشٹر سے نکل کر اس ملک میں تباہی پھیلانا چاہتے ہیں۔ پھر جب میں اپنے ان اکابر کو دیکھتا ہوں جو اجتماعی خطرات کے مقابلے کے لیے عوام کی قوت مدافعت بیدار کرنے کی بجائے اپنی سیاسی چالوں اور سودا بازیوں کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے انگریزوں کے جارحانہ عزائم کا سدباب نہ کیا تو وہ کسی دن دلی پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے مرہٹوں کی جارحیت کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو تمھاری آئندہ نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی اور اگر تم نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے افغانوں کا ساتھ نہ دیا تو شمال میں تمھارا اہم ترین دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار جرم ہے تو میں اس جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ دلی سے احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد میں نے صرف ایک حوصلہ افزا خبر سنی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظام کی افواج نے مرہٹوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے ہیں لیکن کاش میں اودھ، دلی اور روہیلکھنڈ کی افواج کو بھی دکن کی افواج کے دوش بدوش

دیکھ سکتا اور پھر یہی افواج پونا سے آگے ارکاٹ اور مدراس کی طرف بڑھتیں اور اس ملک سے ان فرنگی تاجروں کو نکال کر دم لیتیں جو ہماری عزت اور آزادی کا سودا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد شاید بنگال کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

شجاع الدولہ نے قدرے نرم ہو کر کہا: "تم ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے کسی مرحلہ پر دوسرے امراء سے تعاون نہیں کیا۔ جب مرہٹوں کا خطرہ پیش آیا تھا تو ہم پانی پت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے اور اب بھی اگر کسی مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اس ملک کے امراء نے کوئی متحدہ محاذ بنایا تو ہم ان کا ساتھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے لیکن ہماری حکمت عملی کسی ایسے حلیف کی خواہشات کی تابع نہیں ہو سکتی جس کی وفاداری پر ہمیں پورا بھروسہ نہ ہو۔ تم ہمیں نظام الملک کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیتے ہو لیکن تمھارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نظام کی حمایت کے لیے اٹھیں تو وہ مرہٹوں کے ساتھ سودا نہیں کرے گا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ کو نظام کے لیے نہیں، دکن کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے لیے مرہٹوں کے خلاف میدان میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا مقصد صرف امراء کا اتحاد ہی نہیں بلکہ عوام میں ایک ایسا اجتماعی شعور اور ایک ایسی قوتِ محاسبہ پیدا کرنا ہے جس کا احترام اور خوف کسی رہنما کو بے راہ روی کی اجازت نہ دے۔"

شجاع الدولہ نے طنزیہ لہجے میں کہا: "تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دکن جا کر وہاں کے عوام کا ضمیر بیدار کرو؟ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ میر نظام علی نے جسے تم شاید قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہو۔ مرہٹوں کے خلاف جنگ سے واپس لوٹتے ہی اپنے بھائی صلابت جنگ کو گدی سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ہے۔ ان حالات میں تم مجھے صلابت جنگ کی اعانت کا مشورہ دیتے ہو یا میر نظام علی کی اعانت کا؟" معظم علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے لیے یہ کھیل نیا نہیں۔ جب تک چند خاندان سلطنتِ مغلیہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی شکارگاہیں سمجھتے رہیں گے اور جب تک دلّی کی حکومت میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ اقتدار کے بے حیا دعویداروں کا مقابلہ کر سکے، اس ملک کے مختلف صوبوں میں اس قسم کے کھیل ہوتے رہیں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا: "دلّی کی حکومت کی طرف سے میں تمھیں یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اگر ہم اس وقت دکن کے معاملات میں مداخلت کریں تو میر نظام علی، مرہٹوں یا انگریزوں کے ساتھ سودا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور یہی بات صلابت جنگ کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے متعلق تمھارا یہ قیاس غلط تھا کہ ہم دکن اور مرہٹوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے لیکن کاش دکن میں کوئی ایسی شخصیت ہوتی جسے صحیح معنوں میں ہم اپنا حلیف سمجھ سکتے۔ میر نظام علی کے متعلق اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار سپاہی اور ایک کامیاب سیاست دان ہے اور قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ دکن پر اس کی سیادت تسلیم کر لی جائے گی لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قوم اور ملک کے مستقبل کے متعلق میر نظام علی کے عزائم کیا ہیں۔ اگر تم اپنی سرگرمیاں صرف اودھ کی حکومت پر نکتہ چینی تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تو ہماری یہ خواہش ہے کہ تم دکن جاؤ اور میر نظام کو حال اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرو اور اگر اسے تمھاری باتیں متاثر نہ کر سکیں تو یہ معلوم کرو کہ دکن کو تباہی سے بچانے کی کوئی اور صورت کیا ہو سکتی ہے! دکن کے امراء میں سے کئی تمھیں اپنے ہم خیال مل جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میر نظام علی انتہائی کوتہ اندیش ثابت نہ ہوا تو تم ایسے لوگوں کی مدد سے اسے اپنا ہم خیال بنا سکو گے اور ہم تمھارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار رہیں کہ جب میر نظام ہمارے مشترکہ

دشمنوں کے خلاف کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھائے گا تو ہم اس کا ساتھ دیں گے اور اگر تمھیں اس مہم میں ناکامی ہوئی تو اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ تم ہر معاملے میں ہمیں موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہم بخوشی تمھیں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تم ملک کے کونے کونے میں جا کر ہر بااثر آدمی کو ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا جائے گا اودھ کے تمام وسائل اس کی فتح اور کامیابی کے لیے وقف ہوں گے لیکن اگر تم لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہو تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ اودھ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نجیب الدولہ نے کہا تھا کہ تم ایک کارآمد آدمی ہو اور میں تمھیں قوم کی خدمت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں اب تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم حیدرآباد جانا چاہتے ہو یا نہیں لیکن میں تم سے یہ توقع ضرور رکھوں گا کہ جب تک تم لکھنؤ میں ہو میرے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہیں آئے گی کہ اس ملک کی تمام برائیاں میری ذات کے ساتھ وابستہ کی جا رہی ہیں۔ تم جا سکتے ہو؟"

معظم علی نے چند ثانیے تذبذب کی حالت میں شجاع الدولہ اور حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اہلِ دربار پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں اس شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے سامنے ذرا سی گستاخی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ معظم علی کے ساتھ گفتگو کے دوران میں وہ ہر لحظہ اس بات کے منتظر تھے کہ شجاع الدولہ اچانک تالی بجائے گا اور سپاہی ننگی تلواروں کے پہرے میں اس گستاخ آدمی کو کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی طرف لے جائیں گے اور معظم علی کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید شجاع الدولہ پہریداروں کو آواز دے کر یہ کہہ دے کہ اس گستاخ آدمی کو محل کے دروازے سے باہر نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے لیکن شجاع الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اہلِ مجلس کو حیران اور پریشان دیکھ کر کہا "تمھیں یہ شکایت تھی کہ ایسے خطرناک آدمی کو لکھنؤ میں نہیں رہنا چاہیے

(c) ketabton.com: The Digital Library

ور مجھے یقین ہے کہ اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہے گا۔ ایسا آدمی اپنی ذات کے سوا کسی کے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا۔"

ایک درباری نے اٹھ کر کہا: "لیکن عالیجاہ! اس نے حضور کے سامنے بھی انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "تم اس بات پر حیران ہو کہ میں اس کے ساتھ نرمی سے کیوں پیش آیا۔ سنو! وہ نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں جیسے لوگوں کا دوست ہے، اگر اس پر سختی کی جاتی تو یہ لوگ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے۔ احمد شاہ ابدالی سے کر نصیر خاں بلوچ تک اسے جانتے ہیں اور میری اپنی فوج کے ہزاروں جوان پانی پت کے میدان میں اس کے بہادرانہ کارناموں کے معترف ہیں۔ پھر اس کی باتیں سننے کے بعد تم اسے بدزبان اور گستاخ کہہ سکتے ہو لیکن اس پر بدنیتی کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لیے سردردی کا باعث تھا لیکن میں نے یہ سردردی اب نظام کی طرف منتقل کر دی ہے اور مجھے نظام سے پوری توقع ہے کہ وہ اس کا صحیح علاج کر سکے گا۔ نظام سے یہ بعید نہیں کہ وہ اسے ہمارا ایک جاسوس سمجھ لے اور یہ حضرت حیدرآباد پہنچتے ہی لاپتہ ہو جائیں۔"

ایک درباری نے سوال کیا: "لیکن عالیجاہ اگر وہ یہاں سے نہ گیا تو؟"

شجاع الدولہ نے کہا: "شہر کا کوتوال اس بات کا پورا خیال رکھے گا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔"

معظم علی اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اکبر خاں ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ "بھائی جان میں آپ کے متعلق بہت پریشان تھا۔ کیسے وہاں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں!" معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ "شجاع الدولہ کی خواہش ہے کہ میں لکھنؤ چھوڑ کر حیدرآباد چلا جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے میرے لیے قید خانے کی کوٹھڑی منتخب نہیں کی۔"

www.allurdu.com

اکبر خاں نے کہا: "اس نے آپ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے؟"

"نہیں! اسے اس بات کا یقین تھا کہ میں ایسا حکم نہیں مانوں گا اور اس کی الجھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لکھنؤ کی بجائے حیدرآباد جا کر قوم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان اگر آپ لکھنؤ چھوڑ کر میرے ہاں جانا قبول کریں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ اودھ کی نسبت روہیلکھنڈ میں یوں بھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ابھی میں نے مستقل طور پر لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ایسا وقت آئے گا تو تمہارا گھر میری آخری جائے پناہ ہوگی لیکن ابھی میں حیدرآباد جانا چاہتا ہوں۔ میں شیخ فخر الدین سے کئی بار وعدہ کر چکا ہوں اور اب شجاع الدولہ نے اس وعدے کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ تمہاری بھابی کو بھی حیدرآباد دیکھنے کا شوق ہے۔"

اکبر خاں نے پوچھا۔ "آپ کب جا رہے ہیں؟"

"میں انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان میں آپ کے ساتھ چلوں گا!"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

پندرھواں باب

عطیہ دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے عطیہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا: "آپا جان! آپا جان! وہ آگئے!"

عطیہ نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی: "کون آگئے؟"

"بھائی معظم علی آئے ہیں آپا جان!"

"پھر میں کیا کروں؟" عطیہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں!"

بلقیس اسی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت بچہ اٹھائے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"بھلا بتایئے آپا جان یہ کون ہے؟" اس نے بچے کو عطیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اسے کہاں سے اٹھا لائی ہو؟" عطیہ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"آپا جان! یہ ان کا بیٹا ہے۔ ان کی بیوی اور ان کی ساس ان کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ نیچے امی جان اور ممانی جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔ دیکھیے آپا جان یہ کتنا پیارا

بچہ ہے!"

عطیہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی بچے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے اپنے دل میں جذبات کا تلاطم محسوس کیا اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

بلقیس نے کہا: "چلیے آپا جان وہ آپ کے متعلق پوچھتی تھیں۔"

"تم چلو میں آتی ہوں۔"

بلقیس نے اس کی گود سے بچہ اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عطیہ جھجکتی ہوئی نچلی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ فرحت اور اس کی والدہ فخرالدین کے خاندان کی چند خواتین کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ عطیہ انھیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

بلقیس نے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بھابی جان! یہ عطیہ آپا ہیں۔"

فرحت نے مسکرا کر عطیہ کی طرف دیکھا اور پھر بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تمھیں دیکھنے کے بعد تمھاری بہن کو پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں۔ تمھاری صورتیں بہت ملتی ہیں۔"

عطیہ بڑی عمر کی خواتین اور اپنی ماموں زاد بہنوں کی مجلس میں فرحت کے ساتھ بے تکلفی سے کوئی بات نہ کر سکی لیکن غروب آفتاب کے قریب جب فرحت بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور بلقیس اس کا بچہ اٹھائے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی، عطیہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ فرحت نے کرسی سے اٹھ کر کہا: "آؤ بہن! میں لکھنؤ میں تمھیں بہت یاد کیا کرتی تھی اور تمھارے بھائی جان بھی بہت یاد کیا کرتے تھے۔"

"بھابی جان!" عطیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر فرحت سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "میں ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتی تھی کہ بھائی جان آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور پھر جب انھوں نے ماموں جان کو یہ لکھا کہ آپ مل گئی ہیں تو میں یہ دعا کیا کرتی

(c) ketabton.com: The Digital Library

تھی کہ آپ کسی دن یہاں آئیں "

فرحت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "عطیہ تم فرشتہ ہو اور مجھے ہمیشہ تمھاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ بیٹھ جاؤ!"

عطیہ ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے غور سے فرحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھابی جان ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟"

"کبھی نہیں۔"

عطیہ نے اپنی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے کہا "بھابی جان! آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

فرحت نے ہنستے ہوئے جواب دیا "عطیہ بات یہ ہے کہ تم میرے چہرے میں اپنی آنکھوں کا حسن دیکھ رہی ہو۔"

○

اسی مکان کے مردانہ حصے میں فخرالدین، معظم علی اور اکبر خاں کا خیر مقدم کر رہا تھا، ان کے نوکروں اور گھوڑوں کو دوسری حویلی میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے کے بعد وہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ دیوان خانے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ جب وہ ایک دوسرے کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا "کیسے راستے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، راستے میں ہمیں کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن حیدر آباد سے کوئی آٹھ منزل دور ہمیں یہ پتہ چلا کہ ڈاکو چار دن پہلے ایک چھوٹا سا قافلہ لوٹ چکے ہیں۔"

فخرالدین نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے لیکن اگر مجھے آپ

www.allurdu.com

کی آمد کی اطلاع ہوتی تو میں حیدر آباد کی سرحد سے آگے آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اکبر خاں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔"

معظم علی نے کہا "یہ محض اتفاق تھا کہ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو یہ میرے پاس آئے ہوئے تھے۔"

"لکھنؤ میں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا "پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ اب وہاں معمولی کاروبار رہ گیا ہے اور وہ میں شیر علی خاں کے سپرد کر آیا ہوں۔ میں کچھ عرصہ سیر و سیاحت سے جی بہلانا چاہتا ہوں۔"

فخرالدین مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا "جس معظم علی کو میں جانتا ہوں وہ سیر و سیاحت کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ اپنی خواہش سے یہاں نہیں آئے ہیں۔"

معظم علی نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری خواہشات کیا ہیں؟"

فخرالدین نے کہا "لوگ اپنے مہمانوں سے ایسی باتیں پوچھنا خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کی ہر پریشانی میں حصہ دار بننا اپنا حق سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ میری حق تلفی نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میری پریشانیاں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں میرا صحیح مقام کیا ہے۔ لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ اب ملک کے کسی حصے کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئے گی۔"

فخرالدین نے کہا۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کے ساتھ آپ کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

معظم علی نے جواب دیا ”آپ شاید اسے بزدلی خیال کریں لیکن اس مرتبہ میں نے قید ہونا پسند نہیں کیا۔ پچھلے وقتوں کے حکمران جب اپنے کسی گستاخ عہدہ دار یا مشیر پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے تو اس سے یہ کہا کرتے تھے کہ آپ حج کر آئیں۔ شجاع الدولہ کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ میں ایک گستاخ آدمی ہوں اور اس نے مجھے قید خانے کے داروغہ کے حوالے کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ میں میر نظام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے دکن اور اودھ کے اتحاد کے مکانات معلوم کروں اور میرے خیال میں آج تک اس نے اتنی رعایت کسی اور کے ساتھ نہیں برتی ہوگی۔“

فخرالدین کے استفسار پر معظم علی نے لکھنؤ میں اپنی سرگرمیوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ملاقات کی تفصیلات بیان کردیں۔ اس کے بعد فخرالدین نے کہا ”جب آپ نے مجھے پانی پت کی جنگ کے واقعات لکھے تھے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آپ لکھنؤ واپس کیوں آگئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے بعد آپ تجارت میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد آپ دلّی میں نجیب الدولہ کے ساتھ رہ کر بھی بہت کچھ کرسکتے تھے۔“

معظم علی نے جواب دیا ”احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مجھے دلّی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بے جان بادشاہ جس کا کوئی پرسان حال نہیں، میری آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کاش احمد شاہ ابدالی دلّی کے تخت پر کسی ایسے آدمی کو بٹھا جاتے جس میں اس دور کے طوفانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور ہمت ہوتی۔ نجیب الدولہ اپنے تدبر، اپنی قابلیت، اپنی جرأت، ہمت اور ذہانت کے باوجود گھاس کے تنکوں سے قوم کا دفاعی حصار تعمیر نہیں کرسکتے۔ دلّی کے امراء اور دلّی سے باہر سلطنت کے دوسرے عہدہ دار اگر کسی بات سے بے نیاز ہیں تو وہ قوم کا مستقبل ہے۔ وہ مرکز میں کسی ایسی قیادت کا تصور کرنے پر آمادہ نہیں جس کا اشارہ ہر چھوٹے

بڑے کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ انھیں ایک کٹھ پتلی کی ضرورت تھی اور وہ انھیں مل گئی ہے۔ ان دنوں اس کے تار شجاع الدولہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آگے چل کر یہ معلوم نہیں کہ یہ کٹھ پتلی کس کس کے ہاتھ میں کھیلے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق حاصل کریں گے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دلّی پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بننے والی ہے جو بار بار اسے تاخت و تاراج کرچکے ہیں۔

شیخ صاحب! میں ایک سپاہی ہوں اور اب زندگی کی اس منزل میں داخل ہو رہا ہوں جب قویٰ ڈھیلے پڑجاتے ہیں اور ہمت عزائم کا ساتھ نہیں دیتی۔ تاہم میرے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ کاش میں کسی ایسے شخص کی رفاقت میں جان دے سکتا جس کی نگاہیں میری قوم کے مستقبل سے روشن ہوتیں۔ میرے لیے پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے کسی صوبیدار کی فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنا مشکل نہ تھا لیکن میرے سامنے وہ لوگ تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد قوم کی حفاظت کی بجائے قوم پر حکومت کرنا ہے۔ مجھے اگر صرف اپنی ذاتی خوشی اور سلامتی مطلوب ہوتی تو میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا لیکن مجھے اس وطن کی مٹی سے اسلاف کے خون پسینے کی مہک آتی ہے۔ میں اپنے خرمن کی بجھی ہوئی راکھ سے زندگی کی چنگاریاں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس دور کے رجلِ عظیم کا متلاشی ہوں۔ لکھنؤ سے میں یہ ارادہ لے کر نکلا تھا کہ اگر میں دکن اور اودھ کا اتحاد کرا سکا تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا لیکن دکن کے حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہاں کی فضا لکھنؤ کی نسبت کم متعفن نہیں۔ میر نظام علی کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے پیش نظر میں ملک و قوم کے لیے اس کی ذات سے کوئی نیک توقع وابستہ نہیں کرسکتا تاہم میں اس سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔“

فخرالدین نے کہا ”میر نظام علی ان دنوں بیدار گئے ہوئے ہیں اور شاید چند ہفتوں تک واپس نہ آئیں۔ ان کی واپسی پر آپ کی ملاقات کا انتظام ہوجائے گا لیکن مجھے

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس ملاقات سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ سرنگاپٹم دیکھ آئیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن یہ شہر آپ کے سفر کی آخری منزل بن جائے۔ میں حیدر علی کی آنکھوں میں قوم کے مستقبل کی امیدوں کی روشنی دیکھ چکا ہوں"۔

معظم علی نے کہا "آپ پہلے بھی حیدر علی کی تعریف کر چکے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد مجھے دلیؔ میں ایک نوجوان ملا تھا اور اس نے بھی مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی"۔

فخرالدین نے کہا۔" اس زمانے میں میں نے آپ سے جب حیدر علی کا ذکر کیا تھا وہ اس قدر مشہور نہ تھا۔ ان دنوں میسور کی ریاست بھی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی لیکن آج میسور ایک سلطنت ہے اور مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کرنے والے قسمت آزما اپنے وزیروں اور مشیروں سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ حیدر علی کون ہے؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے باپ دادا کیا کرتے تھے ...؟ آج انگریز، مرہٹے اور نظام جن میں سے ہر ایک جنوبی ہندوستان کو اپنی وراثت سمجھتا ہے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ قدرت نے ان کے راستے میں ایک ناقابلِ تسخیر پہاڑ کھڑا کر دیا ہے اس کی شہرت حیدرآباد، دلیؔ، لکھنؤ، مدراس اور کلکتہ سے نکل کر لندن اور پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسی پرشکوہ شخصیت سے متعارف ہونے کے بعد آپ کو حیدر علی کی شخصیت کس حد تک متاثر کر سکے گی لیکن اس ملک کے حال اور مستقبل کے متعلق اس کے خیالات وہی ہیں جو آپ کے ہیں"۔

معظم علی نے کہا۔" میں لکھنؤ میں بھی اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ اگر وہ اس تاریک دور میں قوم کا مشعل بردار بن سکتا ہے تو میں اس کے پیچھے چلنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔ سر دست میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو دو دن سے زیادہ تکلیف دینا

www.allurdu.com

نہیں چاہتا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے، اس لیے اپنے ایک علیحدہ مکان کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں"۔

فخرالدین نے جواب دیا۔" دیکھیے اگر آپ اس مکان میں اپنے آپ کو ایک اجنبی محسوس کریں تو میں بہتر سمجھوں گا کہ اسے آگ لگا دی جائے۔ اگر آپ حیدرآباد آ کر کہیں اور ٹھہریں تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اور چلا جاؤں"۔

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔" شیخ صاحب آپ خفا ہو گئے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔

فخرالدین نے کہا۔" آپ نے بات ہی ایسی کی تھی"۔

فخرالدین کا رہائشی مکان بہت وسیع تھا اس نے اس کی بالائی منزل کا ایک حصہ معظم علی کے سپرد کر دیا اور اکبر خاں کو مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔

○

چند دن حیدرآباد رہ کر معظم علی کو اس تلخ حقیقت کا زیادہ شدت سے احساس ہونے لگا کہ مرہٹوں کے خلاف میر نظام علی کی فتوحات کی خبریں سن کر اس نے دکن کے مستقبل سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ محض ایک خواب تھیں۔ دلیؔ کے تمام تکلفات حیدرآباد میں آ چکے تھے اور دکن کے امراء دورِ زوال کے مغل شہزادوں کی طرح عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دکن کی بیشتر فوج ان امراء اور جاگیرداروں کے نجی دستوں پر مشتمل تھی جن کا مرکزِ وفا بدلتا رہتا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کی کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر میر نظام علی نے دکن کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے تھے لیکن فوج کی مدد سے صلابت جنگ کو گدی سے اتارنے کے بعد اندرونی خلفشار کے خطرے نے اسے اپنے بیرونی دشمنوں کے ساتھ سودا بازیوں پر مجبور کر دیا تھا۔ ابن الوقت اور مفاد پرست

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

امرا کی اکثریت صلابت جنگ کا ساتھ چھوڑ کر حکومت کے نئے دعویدار کی طرف داری کر چکی تھی اور جن امرا کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی ان کی جگہ نئے جاگیردار پیدا کیے جا رہے تھے۔ میر نظام علی سے بغاوت کرنے والے چند امرا اور فوجی افسر حیدر آباد سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ اس کے دوسرے بھائی بسالت جنگ کو دکن میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ نظام علی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے ادھونی کی حکومت اس کے سپرد کر دی اور دریائے کرشنا کے جنوب میں چند اضلاع اس کے حوالے کر دیئے۔ بسالت جنگ بظاہر ادھونی کا خود مختار حکمران تھا لیکن عملاً اس کی سلطنت حیدر آباد کی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی۔

معظم علی بیکار بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ کبھی فخرالدین کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اکبر خاں کے ساتھ سیر کی نیت سے شہر کے باہر نکل جاتا۔ فخرالدین کے دسترخوان پر دونوں وقت شہر کے چند امرا، تاجر یا علما موجود ہوتے۔ ایک دعوت میں معظم علی کی ملاقات شہر کے ایک ایسے رئیس سے ہوئی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں جمع کرنے پر صرف کرتا ہے۔ اس نے اپنے کتب خانے کی چند نایاب کتابوں کا ذکر کیا اور معظم علی اس کا کتب خانہ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے بعد یہ کتب خانہ معظم علی کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ایک دن معظم علی چند گھنٹے اس کتب خانے میں صرف کرنے کے بعد واپس گھر آ رہا تھا کہ بازار میں کسی نے اچانک اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ معظم علی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اجنبی نے کہا "میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میں دلّی میں آپ سے مل چکا ہوں۔"

معظم علی چند ثانیے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا "ارے آپ اسد خاں ہیں!"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ آپ حیدر آباد میں کیسے پہنچے اور یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں آپ کو اکثر یاد کرتا تھا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دس دن ہو چکے ہیں اور میں شیخ فخرالدین کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں۔"

اسد خاں نے کہا۔ "میں انھیں جانتا ہوں۔"

"آپ یہاں کب تشریف لائے تھے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"میں کوئی بیس دن قبل یہاں آیا تھا لیکن چند دن یہاں رہ کر نظام الملک سے ملاقات کے لیے بیدار چلا گیا تھا۔ پرسوں یہاں واپس پہنچا تھا اور ان شاء اللہ کل یہاں سے سرنگاپٹم روانہ ہو جاؤں گا۔ میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں، چلیے وہاں چل کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔"

معظم علی اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختصراً اپنی سرگزشت سنانے کے بعد اس نے اسد خاں کے بیدار جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ "میں نظام کے پاس حیدر علی کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "پھر آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟"

"میری ملاقات کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب نظام الملک کے ساتھ آئندہ ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا ہے لیکن ذاتی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میر نظام علی جیسے آدمی سے دوستانہ ملاقاتیں کسی کے لیے سود مند ثابت نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ بغلگیر ہونے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں لیکن میسور کے لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ نظام کو خوش رکھا جائے اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیئے جائیں کہ وہ ہمارے خلاف انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

معظم علی نے کہا۔ "آپ کو یاد ہے کہ جب دلی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی؟"

"ہاں مجھے یاد ہے اور میں اب بھی آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر میں کل ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکوں تو میں سمجھوں گا کہ میرا یہ سفر بہت کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کے حالات دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آپ کے بہترین خواب وہاں پورے ہو رہے ہیں۔ آج جب کہ لولے لنگڑے، اندھے بہرے اور اپاہج لوگ قوم کی سیادت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، میسور کا اولوالعزم حکمران اپنی تلوار کی نوک سے اس ملک کے نقشے پر نئی نئی لکیریں کھینچ رہا ہے۔ جب میں نے دلی کی جامع مسجد میں آپ کی تقریر سنی تھی تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار حیدر علی کو دیکھ آئیں۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میرے ساتھ اکبر خاں بھی آیا ہوا ہے۔ وہ دلی میں آپ سے ملا تھا۔ اگر آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

اسد خاں نے جواب دیا۔ "میں ایک دو دن کی بجائے ایک دو ہفتے آپ کے لیے ٹھہر سکتا ہوں۔"

سرکاری مہمان خانے میں پہنچ کر معظم علی دیر تک اسد خاں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر حیدر علی کی شخصیت تھی۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد معظم علی نے اٹھ کر کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں؟"

"ہاں" معظم علی نے جواب دیا۔ "اور اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو ہم انشاءاللہ

www.allurdu.com

پرسوں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

○

اکبر خاں اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور بولا۔ "آپ نے بہت دیر لگائی۔ میں بہت پریشان تھا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں کتب خانے سے نکلا تو راستے میں اچانک اسد خاں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ اسد خاں وہی ہے جو ہمیں دلی میں ملا تھا۔ ہم پرسوں اس کے ساتھ سرنگاپٹم جا رہے ہیں۔ تم تیار ہونا۔"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں لیکن ہمیں بہت جلد واپس آنا پڑے گا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔"

اکبر خاں نے سوال کیا۔ "آپ بھابی جان کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں وہ یہیں رہیں گی۔ شیخ فخرالدین کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں ابھی ان سے مل کر آتا ہوں۔" معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا شیخ فخرالدین کے دفتر میں داخل ہوا۔ شیخ فخرالدین اپنے منشی کو کوئی خط لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھا لیا اور منشی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں تمھیں کچھ دیر بعد بلاؤں گا۔ اس وقت ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

جب منشی کمرے سے باہر نکل گیا تو شیخ فخرالدین نے معظم علی کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ "آپ سارا دن کہاں رہے؟"

معظم علی نے اس کے جواب میں اسد خاں سے اچانک ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ بالآخر جب اس نے سرنگاپٹم جانے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کیا تو فخرالدین نے کہا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

یہ ضروری ہے کہ آپ یا تو اگلے مہینے جائیں یا اس ماہ کے اختتام سے پہلے یہاں واپس آجائیں۔ اگلے مہینے کی تین تاریخ کو عطیہ کی برات آنے والی ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ اور اکبر خان اس موقع پر موجود ہوں۔"

"میں ضرور پہنچ جاؤں گا لیکن ان کی منگنی کہاں ہوئی ہے؟"

"ادھونی کے ایک جاگیر دار کے لڑکے کے ساتھ۔ وہ بسالت جنگ کے رشتے دار ہیں۔ لڑکے کا نام طاہر بیگ ہے اور وہ ادھونی کی فوج میں ملازم ہے۔ عطیہ کی شادی پر آپ کا موجود ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب بلقیس بھی بڑی ہو چکی ہے اور میں ایک ہی دن دونوں بہنوں کی شادی کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔"

"بلقیس کا رشتہ کہاں طے ہوا ہے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

فخر الدین مسکرایا۔ "بلقیس کے لیے میں نے جس نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ اسے آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔"

معظم علی نے غور سے فخر الدین کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں جس نوجوان کو جانتا ہوں اس کا نام اکبر خاں ہے اور اگر آپ نے اسے پسند فرمایا ہے تو میں آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلقیس اگر میری سگی بہن ہوتی تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔"

فخر الدین نے کہا۔ "بلقیس اور عطیہ دونوں آپ کو سگے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں۔"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں ابھی اکبر خاں سے اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔"

فخر الدین نے کہا۔ "اکبر خاں سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہمیں صرف ان کے بھائی جان کی رضامندی کی ضرورت تھی۔ آج صبح جب آپ باہر گئے تھے تو ہمارے گھر میں یہ مسئلہ پیش ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اکبر خاں سے کہا تو اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا اور

آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ اسے بلاوجہ یہاں لائے تھے۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑا ابتداء ہی سے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بارہا میرے دل میں خیال آیا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن جراٴت نہ ہوئی اور اب میرا خیال تھا کہ سرنگا پٹم سے واپس آکر یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کروں گا اور پیش کرنے سے پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈلوا دوں گا۔ تاکہ اگر آپ ہمیں فوراً گھر سے باہر نکالنے کی ضرورت محسوس کریں تو ہمیں پریشانی نہ ہو۔"

فخر الدین نے کہا۔ "میرے دوست میں پتھر اور ہیرے میں تمیز کر سکتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی، اکبر خاں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اکبر خاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم علی نے کہا۔ "اکبر تمھیں گھر سے آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سرنگا پٹم جانے کی بجائے آج ہی لکھنؤ روانہ ہو جائیں۔ تم نوکروں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دو۔ ہم شام سے پہلے پہلے ایک منزل طے کرنا چاہتے ہیں۔"

اکبر خاں کے چہرے پر اچانک مایوسی کے بادل چھا گئے۔

معظم علی نے پھر کہا۔ "جاؤ اکبر دیر نہ کرو! میں شیخ فخر الدین سے اجازت لے چکا ہوں۔"

"لیکن بھائی جان۔۔۔!"

"کیا ہے اکبر؟"

"کچھ نہیں بھائی جان!" اس نے بددلی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے ٹھہرو کیا بات ہے، تم واپس نہیں جانا چاہتے؟"

اکبر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور معظم علی نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد آگے بڑھ کر

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

اسے گلے لگالیا۔

"نالائق تم بہت خوش قسمت ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ شیخ صاحب کے ساتھ تمھاری کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

اکبرخاں کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا رہی تھی۔

تیسرے دن علی الصباح معظم علی اور اکبرخاں، اسدخاں کے ہمراہ سرنگاپٹم کا رخ کر رہے تھے۔

○

ایک روز دوپہر کے وقت معظم علی اور اس کے ساتھی سرنگاپٹم میں داخل ہوئے۔ اسدخاں انھیں اپنے مکان پر ٹھہرا کر حیدرعلی کے پاس چلا گیا۔ شام کے وقت اس نے واپس آکر معظم علی کو اطلاع دی کہ نواب حیدرعلی کل صبح آپ سے ملاقات کریں گے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اکبرخاں اپنے میزبان کے ساتھ شاہی محل کی طرف چل دیئے، وہ پائیں باغ میں داخل ہوئے تو اسدخاں نے باغ کے درمیان ایک سائبان کے قریب پہنچ کر کہا "آپ یہاں تشریف رکھیں۔ اس وقت وہ عام طور پر یہیں ملاقات کیا کرتے ہیں۔"

وہ سائبان کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انھیں دو نوکر اور ایک کم سن لڑکا باغ میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ کمسن لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ تھوڑی دور جا کر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھکا لیکن اس نے غرّا کر اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھائے اور نوکر بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے نوکر نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کمسن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی۔

"اب اسے لے جاؤ!" لڑکے نے نوکر کی طرف زنجیر بڑھاتے ہوئے کہا۔

"حضور یہ کاٹتا ہے۔"

"تم یوں ہی ڈرتے ہو۔ دیکھو!" لڑکے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔

جب شیر کا بچہ لڑکے کا ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا تو اس نے فاتحانہ انداز سے نوکروں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم اگر اس سے ڈرو گے تو یہ خواہ مخواہ کاٹے گا۔"

ایک نوکر نے کہا۔ "نہیں حضور اگر ہم نہ ڈریں تو بھی یہ کاٹتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟" معظم علی نے اسدخاں سے سوال کیا۔

"یہ شہزادہ فتح علی ٹیپو ہیں۔ انھیں شیروں کا بہت شوق ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "ایک شہزادے کے لیے شیروں سے بہتر کیا کھلونے ہو سکتے ہیں۔ انھیں بلایئے۔"

اسدخاں نے اٹھ کر آواز دی۔ "شہزادہ صاحب! ادھر تشریف لایئے!"

ٹیپو، شیر کا بچہ نوکروں کے حوالہ کر کے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا سائبان کی طرف بڑھا۔ معظم علی اور اکبرخاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیپو نے "السلام علیکم" کہہ کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور معظم علی اور اکبرخاں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسدخاں نے کہا۔ "شہزادہ صاحب! یہ معظم علی خاں ہیں۔ آپ مرشدآباد کے رہنے والے ہیں۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے آپ سراج الدولہ کی فوج میں عہدہ دار تھے اور یہ روہیلکھنڈ کے سردار اکبرخاں ہیں۔ آپ پانی پت کی جنگ کے متعلق بہت سوالات کیا کرتے ہیں اور یہ دونوں اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں۔"

شہزادہ ٹیپو نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

تو آپ مجھے جنگ کا نقشہ بنا دیں۔ پھر میں آپ سے چند سوالات پوچھوں گا۔"

ٹیپو کی عمر گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کا چہرہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت مترشح تھی۔ تاہم معظم علی کے نزدیک وہ ایک کمسن بچہ تھا۔

اس نے کہا۔ "بہت اچھا میں آپ کو نقشہ بنا دوں گا۔"

ٹیپو نے کہا۔ "اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی کاغذ قلم منگواتا ہوں۔"

حیدر علی محل کی طرف سے نمودار ہوا اور اسد خاں نے جلدی سے اٹھ کر کہا: "وہ آ رہے ہیں!"

معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا۔ "آپ اباجان سے ملاقات کے بعد کہیں غائب نہ ہو جائیں۔"

اسد خاں نے کہا۔ "شہزادہ صاحب آپ مطمئن رہیں۔ یہ میرے مہمان ہیں اور جب تک یہ نقشہ نہیں بنائیں گے میں انھیں کہیں غائب نہیں ہونے دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی سائبان میں داخل ہوا اور اسد خاں اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ معظم علی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں"

"اور آپ اکبر خاں ہیں؟"

"جی ہاں" اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی اور اکبر خاں کی نگاہیں رعب و جلال کے اس پیکرِ مجسم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ حیدر علی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے خدوخال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ حکم دینے

کے لیے پیدا ہوا ہے۔

حیدر علی نے کہا۔ "اسد خاں تمھاری میزبانی ختم ہو چکی ہے اور آج سے یہ میرے مہمان ہیں۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اسد خاں کی زبانی آپ کی سرگذشت سن چکا ہوں اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔ اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت جلد واپس جانا چاہتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو اس ملک کے مسلمانوں کے لیے کسی مضبوط قلعے کی تلاش ہے تو آپ دوبارہ یہاں آئیں گے۔ جو تڑپ آپ کو پانی پت کے میدان میں لے گئی تھی اور جو ولولہ آپ کو حیدر آباد لایا ہے۔ وہ کسی دن آپ کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گا۔ کاویری کے پانی کے بغیر آپ کی پیاس نہیں بجھے گی۔ اگر آپ ایک اچھے سپاہی ہیں تو میسور کی فوج میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ مدبر اور سیاست دان ہیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے۔ اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو میسور میں آپ کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں اور اگر آپ ایک بلند پایہ عالم ہیں تو یہاں آپ کے قدر دان موجود ہیں۔ اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے سفر کا مقصد اس ملک کے مسلمان حکمرانوں میں اتحاد اور تعاون کے امکانات معلوم کرنا ہے۔ آپ میری طرف سے ان سب کو یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ جب وہ کسی اجتماعی خطرے کی مدافعت کے لیے متحد ہوں گے تو مجھے سب سے اگلی صف میں پائیں گے۔

میرے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ انگریز ہیں اور جب تک جنوب میں ان کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے نظام کی دوستی کا طلبگار ہوں اور اگر مرہٹے پُرامن رہے تو میں ان کے ساتھ بھی الجھنا پسند نہیں کروں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کر نظام انگریزوں کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں کی مدد سے میسور پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے گا اور مرہٹے بھی آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ جنوبی ہند میں ایک طاقتور مسلم حکمران کا عروج برداشت نہیں کریں گے۔ آپ کو بیک وقت ان تین طاقتوں کے خلاف جنگ لڑنی پڑے گی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اودھ اور روہیلکھنڈ کے مفلوج اور بے بس امراء آپ کو کوئی مدد دے سکیں گے۔ میرا مقصد آپ کی حوصلہ شکنی نہیں۔ لیکن بنگال کے واقعات نے مجھے بہت زیادہ حقیقت پسند بنا دیا ہے۔"

حیدر علی مسکرایا: "ایک حقیقت پسند آدمی کی گفتگو میری حوصلہ شکنی یا دلآزاری کا باعث نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن مجھے تنہا ان بھیڑیوں اور گیدڑوں کی افواج کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا لیکن مجھے خدا کی اعانت پر بھروسہ ہے، اگر مجھے کام کرنے کی مہلت مل گئی تو میں میسور کی سرزمین کو ایک ناقابل تسخیر قلعے میں تبدیل کر دوں گا۔ میں وہ فوج تیار کروں گا۔ جو ہر میدان میں ان حریص طالع آزماؤں کے دانت کھٹے کر سکے گی۔ میرے جھنڈے تلے کرائے کے سپاہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں اس وطن کی خاک اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہوگی۔ جب تک میرے ہاتھ تلوار اٹھا سکیں گے میں لڑتا رہوں گا اور آپ جیسے لوگ حیدرآباد، [illegible] دہلی کے مسلمانوں کو یہ بتا سکیں گے کہ میسور کی جنگ تمہاری بقا اور تمہاری عزت اور آزادی کی جنگ ہے۔"

حیدر علی کی گفتگو کے دوران میں معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ برسوں بے آب و گیاہ صحراؤں میں گھومنے کے بعد اپنے سپنوں کی وادی میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا دل حیدر علی کے لیے عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس نے کہا: "مجھے یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں ابھی سے کاویری کے پانی کی مٹھاس محسوس کر رہا ہوں۔"

حیدر علی نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "میں آپ کا انتظار کروں

گا لیکن جتنے دن آپ یہاں ہیں، میں آپ کی موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اب انشاء اللہ شام کے وقت ملاقات ہوگی۔"

سائبان سے تھوڑی دور محل کے دروازے کے سامنے چند سپاہی اور افسر گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اکبر خاں سے ہاتھ ملایا اور شہزادہ ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "آؤ فتح علی!"

ٹیپو نے کہا: "ابا جان مجھے ان سے ایک کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک پہنچ جاؤں گا۔"

حیدر علی نے جواب طلب نگاہوں سے اسد خاں کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ "عالی جاہ! شہزادہ ٹیپو ان سے پانی پت کے میدان کا نقشہ بنوانا چاہتے ہیں۔"

حیدر علی نے مسکرا کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ یہاں آپ کی ضرورت ہے؟"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا اور معظم علی اکبر خاں، اسد خاں اور شہزادہ فتح علی ٹیپو کے ساتھ شاہی مہمان خانے میں داخل ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے حکم سے ایک سپاہی کاغذ اور قلم لے آیا اور معظم علی قالین پر بیٹھ کر نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ معظم علی کا خیال تھا کہ ایک کمسن لڑکے کو مطمئن کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگے گا لیکن شہزادہ ٹیپو کے غیر متوقع سوالات کے جواب میں اسے میدان جنگ کی تمام تفصیلات اور جزئیات پر تبصرہ کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کاغذ ان بیشمار نشانات اور لکیروں سے بھر چکا تھا۔ جن سے فریقین کے پڑاؤ، ان کے رسد اور کمک کے راستوں، ان کی افواج کی صفوں اور ان کے توپخانوں اور مختلف معرکوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

نقشہ ختم کرنے کے بعد معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پانی پت کی جنگ کی پوری تاریخ بیان کر چکا ہے۔ جب کمسن شہزادہ نقشہ لے کر معظم علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

وہاں سے چلا گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، خدا اس لڑکے کو نظرِ بد سے بچائے۔ بعض اوقات اس کے سوالات سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے سپہ سالار سے باتیں کر رہا ہوں۔ شہزادہ کی عمر کتنی ہے؟"

اسد خاں نے جواب دیا "ان کی عمر بارہ سال سے کم ہے لیکن حیدر علی کے بیٹے کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔ قدرت نے اسے ایک غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے۔ کل اگر آپ اس کا امتحان لیں تو یہ نقشہ اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہوگا۔"

معظم علی نے کہا "پہلے میرا خیال تھا کہ بچے کو بہلانے کے لیے چند الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دوں گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اس لڑکے سے باتیں کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کسی دن میرے جیسے ہزاروں انسان اس کی رفاقت میں جینا اور مرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ اسد خاں، تم درست کہتے تھے۔ مجھے بہت جلد دوبارہ یہاں آنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ میں حیدرآباد سے لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر دوں۔"

اگلی صبح اسد خاں، معظم علی اور اکبر خاں کو شہر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ دکھانے کے لیے لے گیا جہاں تلواریں، بندوقیں اور توپیں بنائی جا رہی تھیں۔ بندوقوں کے کارخانے کی نگرانی ایک فرانسیسی ماہر کے سپرد تھی۔ کارخانے کے منتظم نے معظم علی کو چند بندوقیں دکھانے کے بعد کہا "یہ بندوقیں ولایت کی بہترین بندوقوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے سال تک توپیں بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔"

اسلحہ سازی کا کارخانہ دیکھنے کے بعد اسد خاں اپنے مہمانوں کو فوجی مستقر میں لے گیا جہاں ہزاروں سپاہی پریڈ کرنے اور دفاعی مورچے تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ وسیع میدان میں کہیں نیزہ بازی اور کہیں چاند ماری ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو گھوڑوں

پر سوار ہو کر مختلف فوجی کھیلوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔

اسد خاں نے معظم علی سے کہا "اگر آپ میسور کا دورہ کریں تو آپ کو یہاں کے ہر شہر میں اسی طرح کا جوش اور ولولہ دکھائی دے گا۔ حیدر علی ملک کے ہر باشندے کو سپاہی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا "انھوں نے شہزادہ ٹیپو کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے؟"

اسد خاں نے جواب دیا "حیدر علی کے سامنے اہم ترین مسئلہ ٹیپو کی تعلیم ہے۔ ٹیپو کے استاد اپنے وقت کے بہترین عالم ہیں۔ نواب حیدر علی یہ کہا کرتے ہیں کہ قدرت نے میرے ہاتھ میں صرف تلوار دی ہے لیکن میرے بیٹے کے ہاتھ میں قلم بھی ہوگا۔ ٹیپو کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ انھیں ایک سبق دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"

فرحت کی ماں اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہوئی تھی اور فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی عطیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ ننھا صدیق علی ایک جھولے میں سو رہا تھا۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا "بھائی جان! بھائی جان! بھائی جان آ گئے!"

فرحت کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ عطیہ نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا "بلقیس تم اتنی بدحواس کیوں ہو۔ بھائی جان کے ساتھ تمہارے دولہا میاں بھی آئے ہیں یا نہیں؟"

بلقیس پریشانی کی حالت میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ فرحت نے مسکرا کر کہا "عطیہ دیکھو میری بہن کو مت چھیڑو۔ آؤ بلقیس بیٹھ جاؤ!"

بلقیس آگے بڑھ کر فرحت کے قریب بیٹھ گئی۔ عطیہ نے اسے دبا کہا "بھابی جان سچ کہتی ہوں بلقیس کئی دن سے پریشان تھی اور آج صبح

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہی بدحواس تھی۔"

بلقیس اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور سراپا احتجاج بن کر بولی۔" بھابی جان! آپا مجھے تنگ کرتی ہیں!"

"نہ بھئی عطیہ میری ننھی بہن کو تنگ نہ کرو۔"

عطیہ نے کہا۔" بھابی جان یہ بالکل مصنوعی غصہ ہے۔ ہم پر خواہ مخواہ رعب ڈالا جا رہا ہے۔ ورنہ یہ دل میں ہنس رہی ہے۔"

فرحت نے کہا۔" ہاں بھئی تم سچ کہتی ہو یہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔"

بلقیس تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی لیکن دروازے کے باہر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور مڑ کر کمرے کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔" بھابی جان! بھائی جان وہ اوپر آ رہے ہیں۔"

عطیہ بدحواس ہو کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جب وہ برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو بلقیس نے پیچھے سے اچانک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔" ٹھہریئے آپا جان آپ کیوں بھاگ رہی ہیں وہ تو ماموں جان کے دفتر میں گئے ہیں۔"

"بڑی چڑیل ہو تم!" عطیہ نے مڑ کر کہا۔

چند دن بعد اسی مکان کے نچلے حصے کے ایک کمرے میں عطیہ اور بلقیس دلھنوں کے لباس اور قیمتی زیورات پہنے بیٹھی تھیں عطیہ کی برات دو دن شیخ فخرالدین کے یہاں قیام کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فرحت دلھنوں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے عطیہ اور بلقیس کے گلوں میں یکے بعد دیگرے موتیوں کا ایک ایک ہار ڈالتے ہوئے کہا۔" یہ تمھارے بھائی جان کا تحفہ ہے۔"

عطیہ کی برات بڑی دھوم دھام سے آئی تھی۔ فخرالدین نے اپنی بہن کو یہ احساس نہ

www.allurdu.com

ہونے دیا کہ اس کی بیٹیاں یتیم ہیں۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو بیش قیمت زیورات کے علاوہ دو دو ہاتھی اور تیس تیس گھوڑے جہیز میں دیئے۔

عطیہ کا شوہر ایک خوش وضع نوجوان تھا اور معظم علی اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے معظم علی کو بڑے اصرار کے ساتھ ادھونی آنے کی دعوت دی۔ عطیہ کی سواری کو رخصت کرنے کے بعد معظم علی مہمان خانے کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اکبر خاں شادی کے لباس میں بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"کچھ نہیں بھائی جان!" اکبر خاں نے جواب دیا۔" مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میری وجہ سے شیخ فخرالدین کی سبکی ہوئی ہوگی۔ حیدر آباد کے امرا میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوں گے۔ میں رسومات کا قائل نہیں لیکن شیخ فخرالدین کی خاطر ہمیں روہیلکھنڈ سے برات کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔"

معظم علی نے کہا۔" ارے میں سمجھا تھا کہ تم پانی پت کی جنگ کے متعلق سوچ رہے ہو۔ شیخ فخرالدین تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ اگر وہ دکھاوے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسی شہر سے دس ہزار آدمی تمھاری برات میں جمع ہو سکتے تھے۔ تم بہت خوش قسمت ہو اکبر! امی نے تمھارے لیے اس لڑکی کو اس دن منتخب کیا تھا۔ جب حیدر آباد کے راستے میں ان لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ فخرالدین تمھیں کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرانے پر مصر ہیں اور اتنے دن مجھے بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمھاری منزل روہیلکھنڈ ہوگی اور میرا رخ سرنگا پٹم کی طرف ہوگا۔ میں لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں۔ وہاں میری جائداد میں شیر علی اور تم برابر کے حصہ دار ہو۔ میں نے انھیں یہ لکھ دیا ہے کہ آئندہ وہ تجارت میں میرے حصے کا منافع تمھیں بھیجتے رہیں۔ آج تمھاری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تمھیں اپنے گھر پہنچ کر نئی نئی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

اکبر خاں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بھائی جان یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ مجھے آپ کی جائداد کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن آپ کی رفاقت سے محروم ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اگر آپ سرنگاپٹم جانا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ ورنہ روہیلکھنڈ میں میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلتے؟ میں آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ آپ وہاں ایک اجنبی ہیں۔"

معظم علی نے شفقت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: "اکبر میں اپنی منزل دیکھ چکا ہوں۔ میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے صرف اپنے فرائض کا احساس سرنگاپٹم لے جا رہا ہے۔"

"تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں اکبر! تمھارے فرائض تمھیں روہیلکھنڈ بلا رہے ہیں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔ تم ایک قبیلے کے سردار ہو اور ان لوگوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں۔ میرے ساتھ رہ کر تم نے جو تجربات حاصل کیے ہیں وہ تمھاری رہنمائی کریں گے۔ میں تمھیں روہیلکھنڈ کا بہترین سردار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی وہاں جاؤں تو تمھارے قبیلے کے ہر فرد کے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹیں دیکھوں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ تم روہیلکھنڈ کے مسلمانوں کی آزادی کے پاسبان بنو اور تمھارے بعد تمھارے بیٹے یا پوتے اپنے وطن کی آزادی کا پرچم بلند رکھیں۔

اگلے ہفتے یہاں سے ایک قافلہ لکھنؤ جا رہا ہے۔ شیخ فخرالدین کی خواہش ہے کہ تم اس قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ پہلے وہ تمھیں یہاں رکھنے پر مصر تھے لیکن میرے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمھیں اپنے گھر جانا چاہیے۔"

شادی سے دس دن بعد اکبر خاں، حیدرآباد سے لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔ بلقیس اپنی

www.allurdu.com

دو خادماؤں کے ساتھ ایک بہلی میں سوار تھی۔ جہیز کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی حفاظت کے لیے فخرالدین نے قافلے کو ناکافی سمجھ کر ان کے ساتھ اپنے پچاس مسلح نوکر روانہ کر دیئے تھے۔ اکبر خاں شہر سے باہر نکلتے ہی معظم علی سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن معظم علی کچھ دور اس کا ساتھ دینے پر مصر تھا۔ شہر سے ایک کوس دور آنے کے بعد اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان! آپ بہت دور آ گئے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں اکبر خاں میں کچھ دور اور تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد اکبر خاں نے پھر ایک بار خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن معظم علی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ قافلے نے ایک بستی سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ نوکروں نے بلقیس کا خیمہ نصب کر دیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بلقیس اپنے خیمے میں سو رہی تھی اور معظم علی اور اکبر خاں تھوڑی دور کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے بعد جب قافلہ دوبارہ روانہ ہونے لگا تو اکبر خاں نے کہا "بھائی جان آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے اب آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ ورنہ آپ کو روہیلکھنڈ تک ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "نہیں، اب میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ اب تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور دیکھو میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا ــــ خدا حافظ ــــ!" معظم علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اکبر خاں مصافحہ کرنے کی بجائے بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آج تو میں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ رہا ہوں۔"

"جاؤ، نالائق!" معظم علی کی آواز اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔

اکبر خاں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ قافلہ چند قدم آگے جا چکا تھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے ایک ثانیہ کے لیے مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا "خدا حافظ! میرے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی، میرے باپ، خدا حافظ!"

معظم علی کچھ دیر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا رہا۔ پھر اس نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیلے پر گھوڑا روک کر درختوں میں روپوش ہوتے ہوئے قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔

تیسرے دن معظم علی ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ میسور کا رخ کر رہا تھا۔

سولھواں باب

سرنگا پٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے ایام معظم علی کے لیے قدرت کا بہترین انعام تھے۔ میسور کی سرزمین اس کے خوابوں کی جنت تھی اور زندگی کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ وہ ایک ایسے قافلے کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا جس کے مسافروں کے دل ذوق یقین سے لبریز تھے۔ وہ اپنی منزل مقصود دیکھ چکا تھا اور اسے اپنے راستے کے نشیب و فراز کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے زندہ رہنے کے لیے ایک مقصد کی ضرورت تھی اور سرنگا پٹم میں آباد ہونے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ہر سانس ایک مقصد کے لیے وقف ہے۔ اس نے حیدر علی کی فوج کے پانچ سو سواروں کے کماندار کی حیثیت سے سرنگا پٹم میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی محنت، قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرنگا پٹم کی محفوظ فوج کے تین ہزار جوانوں کا سالارِ اعلیٰ بن گیا۔ نظم و ضبط اور مستعدی کے لحاظ سے اس سے تربیت حاصل کرنے والے سپاہیوں کو حیدر علی کی فوج میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سرنگا پٹم پہنچنے کے پہلے اور تیسرے سال اس کے ہاں دو لڑکے اور پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام مسعود علی اور دوسرے کا نام انور علی رکھا گیا۔ اکبر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ اس کی خط و کتابت جاری رہی لیکن آہستہ آہستہ نامہ و پیام کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ان تھک مصروفیت کے باوجود اسے فرحت کی رفاقت میں زندگی کے ماہ و سال

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مکان سرنگاپٹم کے چند بہترین مکانات میں سے ایک تھا۔ میسور کی فوج کے بڑے بڑے آزمودہ کار جرنیل اور افسر اسے اپنا دوست اور رفیق سمجھتے تھے۔ حیدر علی اہم ترین قومی اور سیاسی معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا اور وہ کمسن شہزادہ ٹیپو جس کی روشن پیشانی پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی، اپنی فرصت کے لمحات اس کی صحبت میں بسر کیا کرتا تھا۔ معظم علی اپنی رفیقۂ حیات سے اکثر یہ کہا کرتا تھا۔ "فرحت! مجھے قدرت سے اب صرف ایک گلہ ہے اور وہ یہ کہ جب مجھ میں دشوار گزار راستوں پر چلنے کی ہمت تھی تو میرے سامنے تاریکیاں تھیں اور جب میں صبح کی روشنی میں اپنی منزل دیکھ رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاؤں زیادہ دیر میرا بوجھ نہیں سہار سکیں گے۔ کاش میں اس ماضی کو واپس لا سکتا جس کی ہر آن زندگی کی دھڑکنوں سے لبریز تھی۔ صدیق، مسعود اور انور خوش نصیب ہیں۔ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کا قائد سالار فتح علی خاں ٹیپو ہوگا۔"

جن ایام میں سلطنتِ خداداد میں حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے باقی حصوں میں آئے دن نئے نئے انقلاب آ رہے تھے۔

بنگال کا نام نہاد حکمران میر قاسم، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کی جگہ گدی پر بٹھایا تھا۔ ۱۷۶۳ء تک اپنے انگریز سرپرستوں کو اپنی رعایا کا خون مہیا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بنگال کے عوام روٹی تک کے محتاج ہو چکے تھے لیکن انگریزوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور میر قاسم کو اپنا خزانہ خالی کرنے، اپنی بیگمات کا زیور بیچنے ملک کے تاجروں اور زمینداروں کو لوٹنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کی بھوک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس سے بنگال کی حکومت کی گدی چھین کر دوبارہ میر جعفر کے حوالہ کر دی۔ میر قاسم نے بنگال سے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی۔ نواب وزیر اودھ اور مغل شہنشاہ شاہ عالم

جو ان دنوں الٰہ آباد میں اپنی بیچارگی کے دن گزار رہا تھا۔ میر قاسم کو مدد دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر جان بچائی اور شہنشاہ جسے ابھی تک دلّی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملا۔ انگریزوں کی فوج نے لکھنؤ کا رخ کیا اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریزوں نے نواب وزیر اودھ سے پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ وصول کیا اور الٰہ آباد اور کورہ کے اضلاع چھین کر شاہ عالم کے حوالے کر دیئے۔ الٰہ آباد کا قلعہ بھی انھوں نے شہنشاہ کے لیے خالی کروالیا۔ اور اس کی حفاظت پر انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ بالفاظِ دیگر دلّی کا برائے نام شہنشاہ الٰہ آباد میں انگریزوں کا دستِ نگر اور وظیفہ خوار بن گیا اور اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کے دروازے کھل گئے۔

۱۷۶۵ء میں میر جعفر نے وفات پائی اور انگریزوں نے اس کے پندرہ سالہ بیٹے نجم الدولہ کو بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ بطور خراج پیش کرنے کی شرط پر بنگال کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

شمال میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے گورنروں کی سرگرمیاں اب زیادہ تر سکھوں کی بغاوتوں کو فرو کرنے تک محدود تھیں اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے علاوہ چہار محل لاہور، جالندھر، دوآب، سرہند اور ملتان کے علاقے سکھوں کے ہاتھوں بارہا تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، نصیر خاں بلوچ اور نجیب الدولہ کی افواج انھیں کئی میدانوں میں عبرت ناک شکستیں دے چکی تھیں لیکن بدقسمتی سے ان شاندار فتوحات کے باوجود سکھوں پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے پنجاب میں مستقل طور پر کوئی بڑی فوج موجود نہ رہ سکی۔ جب احمد شاہ ابدالی کا لشکر پیشقدمی کرتا تو سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے لیکن ان کی واپسی

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کے ساتھ ہی وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ قتل و غارت شروع کر دیتے۔

جنوب میں مرہٹے دوبارہ سر اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے پانی پت کی جنگ میں جو زخم کھاتے تھے۔ وہ مندمل ہو رہے تھے لیکن ان کی توجہ شمال کی بجائے جنوب کی طرف تھی، یہاں نظام اور انگریز ان کے حریف تھے لیکن یہ تینوں طاقتیں اب ایک دوسرے سے نظریں ہٹا کر حیدر علی کی توجہ متوجہ ہو چکی تھیں میسور کی خوشحالی اور ترقی اور میسور کے حکمران کی شخصیت ان سب کی آنکھ کا ناسور بن چکی تھی۔ حیدر علی کی طاقت کچل کر میسور کی بندر بانٹ کرنے کے لیے ۱۷۶۷ء میں ان گدھوں، بھیڑیوں اور گیدڑوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ میر نظام علی نے اپنے انگریز اور مرہٹہ حلیفوں کے ساتھ حملے کی تفصیلات طے کرنے کے بعد بنگلور کی طرف پیشقدمی کی اور وہاں سے کوئی تیس میل دور چینا پٹنا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میر نظام علی کے دسیع خیمے میں محفل رقص و سرور آراستہ تھی۔ وزراء اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دائیں بائیں رونق افروز تھے۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا۔ "حضور! انگریز فوج کا ایک کپتان اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔"

نظام نے جواب دینے کی بجائے قہر آلود نگاہوں سے اپنے سپہ سالار تہور جنگ کی طرف دیکھا اور وہ قدرے توقف کے بعد اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

نظام علی نے مشیر الملک کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ ایسی بارش میں بھی آرام نہیں کرتے۔ میں انھیں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ موسم جنگ کے لیے موزوں نہیں۔"

مشیر الملک نے جواب دیا۔ "لیکن حضور! مدراس کے گورنر کا یہ خیال تھا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہمیں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لینا چاہیے۔ اگر مرہٹوں کی طرف سے تاخیر نہ ہوتی تو اس وقت تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔"

نظام نے جواب دیا۔ "مرہٹے ہماری نسبت زیادہ ہوشیار ہیں۔ وہ اس وقت تک میدان میں نہیں آئیں گے جب تک کہ آدھی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔"

نظام کے محافظ دستوں کے سالارِ اعلیٰ شمس الامراء نے کہا۔ "حضور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مزید ہوشیاری کا ثبوت دیں اور جنگ میں شریک ہی نہ ہوں۔"

مشیر الملک نے برہم ہو کر کہا۔ "آپ کو حضور نظام کے اتحادیوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

شمس الامراء نے جواب دیا۔ "معاف کیجیے، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضور نظام کی وفاداری میں کوئی مجھ سے آگے ہے لیکن جب تک مرہٹے میدان میں نہیں آجاتے میں ان کی نیک نیتی کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

مشیر الملک کی توقع کے خلاف نظام نے شمس الامراء کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تم درست کہتے ہو۔ ہم نے مرہٹوں کے متعلق اطمینان کئے بغیر پیشقدمی کرنے میں غلطی کی ہے۔"

شمس الامراء نے مشیر الملک کی طرف ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "حضور میں شروع سے ہی اس پیشقدمی کے خلاف تھا۔ خدا معلوم اگر ہم مرہٹوں کی فوری اعانت کے بھروسے پر بنگلور پر حملہ کر دیتے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوتی!"

تہور جنگ دوبارہ خیمے میں داخل ہوا اور اس نے نظام کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ "ایلچی، مدراس کے گورنر کی طرف سے کوئی اہم پیغام لایا ہے اور وہ اسی وقت قدمبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

"بہت اچھا۔ یہ محفل برخاست ہوتی ہے۔ بلاؤ اسے۔"

نظام کے اشارے سے رقاصائیں اور سازندے خیمے کے دوسرے دروازے سے نکل کر ساتھ والے خیمے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز افسر خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی طریقے سے سلام کرنے کے بعد ایک تھیلا جو اس کی کمر سے لٹک رہا تھا، کھولا اور ایک مراسلہ نکال کر نظام کو پیش کر دیا۔ نظام نے مراسلہ پڑھ کر مشیر الملک کو دے دیا۔

انگریز افسر نے کہا: "یور ہائینیس مجھے کرنل اسمتھ کا حکم ہے کہ میں کسی تاخیر کے بغیر اس خط کا جواب لے کر پہنچ جاؤں۔"

نظام نے جواب دیا۔ "ہم کرنل اسمتھ کو لکھ چکے ہیں کہ مرہٹوں کی طرف سے اطمینان کیے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "ہز ایکسیلینسی گورنر مدراس اس مکتوب میں آپ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مرہٹے، سرنگا پٹم کی طرف آپ کی پیشقدمی کی اطلاع پاتے ہی میدان میں آجائیں گے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور دوسرا ملیبار میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔"

نظام نے کہا۔ "لیکن اگر بارش کا یہی حال رہا تو آپ کی کوئی تجویز ہمارے لیے قابلِ عمل نہیں ہوگی۔ ایسا موسم صرف حیدر علی کی پنڈارہ فوج کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اب تک ہم نے اسلحہ، بارود اور رسد کا جو سامان یہاں جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں اس میں سے نصف دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے، اس وقت ہماری جتنی فوج اس پڑاؤ میں ہے قریباً اتنی ہی رسد و کمک کے راستوں میں پہرہ دے رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رسد و کمک کا کوئی دستہ صحیح سلامت یہاں نہیں پہنچا۔ اگر مرہٹے معاہدے کے مطابق ہمارا ساتھ دیتے تو ہمیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس پانی اور کیچڑ میں

اگر پیشقدمی شروع کر دیں تو ہمیں دنوں کے سفر کے لیے ہفتے درکار ہوں۔ ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کے چھاپہ مار دستے ہوں گے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "معاف کیجیے آپ کو دشمن کی طاقت کے غلط اندازے نے پریشان کر دیا ہے۔ ہماری فوج ملیبار کی طرف پیشقدمی شروع کر چکی ہے اور بارش وہاں بھی ہو رہی ہے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی خرابی کے باعث ہماری اور ہمارے دشمن کی مشکلات ایک جیسی ہیں۔"

نظام نے جواب دیا۔ "ملیبار کے ساحلی علاقے پر آپ کا سہارا آپ کا بحری بیڑہ ہے لیکن مجھے یہاں بیل گاڑیوں سے کام لینا پڑے گا۔"

"تو میں آپ کی طرف سے کیا جواب لے جاؤں؟"

"مدراس کے گورنر کے لیے ہمارا پہلا جواب کافی ہے۔"

"لیکن اس خط میں گورنر نے یہ لکھا ہے کہ آپ کرنل اسمتھ کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیں۔"

"کرنل اسمتھ کو ہمارا جواب ایک ہفتہ تک پہنچ جائے گا۔"

انگریز افسر نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل آپ کی خدمت میں ہماری طرف سے ایسے لوگوں کا وفد آئے گا جو آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکیں گے۔"

"اگر کوئی وفد مرہٹوں کی نیک نیتی کے متعلق مجھے یقین دلا سکا تو مجھے اپنی رائے بدلتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ وفد میرے پاس آنے کی تکلیف کرنے سے پہلے مرہٹوں کے ساتھ بات چیت کر آئے۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملیبار میں ہماری کامیابیوں کی اطلاعات سننے کے بعد آپ مرہٹوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

نظام نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

انگریز افسر سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد رقص و سرود کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ جب یہ محفل پورے شباب پر تھی اور ایک لونڈی میر نظام علی کے جام میں شراب ڈال رہی تھی، خیمے سے باہر سپاہیوں کا شور سنائی دیا۔ حاضرینِ مجلس جواب طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نظام نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور طبلے اور سارنگی کی صدائیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ رقاصائیں تذبذب کی حالت میں کھڑی تھیں۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا۔ "عالیجاہ ایک آدمی اسی وقت قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے!"

"کون ہے وہ؟" نظام نے جھنجھلا کر کہا۔

"عالیجاہ وہ کہتا ہے کہ میں حیدر کا ایلچی ہوں۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "تم نے اسے پڑاؤ سے باہر کیوں نہیں روکا، وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟"

"جناب وہ سرپٹ آ رہا تھا اور اس نے پہرہ داروں کی کوشش کے باوجود اپنا گھوڑا نہیں روکا۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "جاؤ اسے قید میں رکھو!"

افسر نے کہا۔ "لیکن حضور! اس نے دھمکی دی ہے۔"

"کیا دھمکی دی ہے اس نے؟"

"حضور اگر آپ کا حکم ہو تو اس کی زبان کھینچ لی جائے!"

نظام نے تلملا کر کہا۔ "بیوقوف! پہلے یہ بتاؤ وہ کہتا کیا ہے؟"

"عالیجاہ! وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں اسی وقت حضور کے ساتھ بات نہ کر سکا تو کل شام تک اس پڑاؤ کا صفایا ہو جائے گا۔"

سپہ سالار تہور خاں نے اٹھ کر اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی پاگل ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں!"

نظام نے کہا۔ "نہیں ٹھہرو اسے اندر بلاؤ!"

افسر باہر نکل گیا اور چند ثانیے بعد معظم علی کیچڑ اور پانی سے لت پت نظام کے خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے "السلام علیکم" کہہ کر مجلس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اس بے وقت مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمائیے لیکن میرے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری تھا۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "حیدر علی نے اپنے ایلچیوں کو معذرت پیش کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "حیدر علی کے ایلچی کو آپ کے آداب سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے یہ پیغام دینے آیا ہوں کہ اگر آپ مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر یہاں آئے ہیں تو وہ اس جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ انھوں نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے۔"

مشیر الملک نے کہا۔ "حیدر علی کی گیدڑ بھبکیاں ہمیں متاثر نہیں کر سکتیں۔ اگر مرہٹوں کی علحدگی کی خبر درست ہو تو بھی ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "لیکن یہ بات آپ کو یقیناً متاثر کرے گی کہ اس وقت آپ ہمارے مکمل محاصرے میں ہیں۔ کل تک آپ کا یہ پڑاؤ چاروں طرف سے ہماری توپوں کی زد میں ہوگا۔ مجھے حیدر علی نے آپ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ میں ان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ حیدر علی کے اس اقدام کو آپ کمزوری یا بزدلی سے تعبیر نہ کریں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ہمیں اس ملک

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کا مستقبل عزیز ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں ہماری غلطیوں کی سزا بھگتیں۔ ہمیں آپ کی فوجی طاقت کا اعتراف ہے لیکن کاش آپ یہ قوت ہندوستان کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے کام میں لا سکتے۔ اگر آپ قوم کے رہنما بنیں تو حیدر علی آپ کی قیادت میں اس ملک کے دشمنوں کے ساتھ لڑنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھیں گے۔ میں آپ کو انگریز کے خلاف اتحاد کی دعوت دینے آیا ہوں لیکن اگر آپ انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کتراتے ہیں تو مرہٹوں کی طرح الگ ہو جائیں اور ہمیں ان سے نپٹنے دیں۔"

نظام نے کہا "اگر ہم انگریزوں کا ساتھ چھوڑنا پسند نہ کریں تو؟"

معظم علی نے جواب دیا "تو پھر ہمیں افسوس ہوگا۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہوگا کہ ہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے۔ ہمیں آپ کے اس لشکر کی تباہی کا افسوس ہوگا جو اس وقت محاصرے کی حالت میں ہے۔ مرہٹے میدان سے نکل چکے ہیں اور انگریز ملیبار کا محاذ چھوڑ کر آپ کی مدد کے لیے نہیں آ سکتے۔ یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ آپ کتنی دیر ہمارے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور پسپائی کی حالت میں آپ کو کس تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیدر علی کو اس تباہی کا افسوس ہوگا لیکن مستقبل کے مورخ اسے قصوروار نہیں گردانیں گے۔"

نظام نے کہا "تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم حیدر علی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جائیں گے۔"

"یہ دھمکی نہیں، آپ کے سوال کا سیدھا سادہ جواب ہے لیکن آپ اگر اسے دھمکی سمجھتے ہیں تو اپنے کسی سمجھدار افسر کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ میں اسے ہر محاذ کی سیر کرانے کے لیے تیار ہوں۔ پھر وہ آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی فوج کے بچ نکلنے کے امکانات کیا ہیں۔ حیدر علی اپنی نیک نیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا دے سکتے

ہیں کہ انھوں نے اپنے ولیعہد شہزادہ فتح علی ٹیپو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

میر نظام علی خان نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "شہزادہ فتح علی ٹیپو کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر میری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے لیکن اگر میری معروضات آپ کو متاثر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں ضرور پہنچ جائیں۔ میں آپ کو اس وقت بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ دکن سے آپ کی رسد اور کمک کے راستے بند ہو چکے ہیں۔ آج آپ کے سامان رسد کی جو پچاس گاڑیاں آ رہی تھیں وہ اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں اور سپاہیوں کا جو دستہ ان کے ساتھ تھا وہ ہماری قید میں ہے۔ اس دستے کے افسر کا نام صولت خان ہے۔"

محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ نظام نے یکے بعد دیگرے اپنے وزیروں اور افسروں کی طرف دیکھا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ہم شہزادہ ٹیپو کے ساتھ مصالحانہ گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم یہاں سے کوچ کریں گے تو میسور کی فوج ہمارا تعاقب نہیں کرے گی؟"

"شہزادہ ٹیپو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر آپ کو نقصان پہنچانا ہی مطلوب ہوتا تو ہمارے لیے بہترین موقع تھا۔"

میر نظام علی نے کہا۔ "تم شہزادہ ٹیپو کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

شمس الامرا نے کہا۔ "عالی جاہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں آپ کو اجازت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور شمس الامرا گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ ٹیپو کی قیام گاہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کارخ کررہے تھے۔

اگلے دن نظام کے کیمپ میں شہزادہ فتح علی ٹیپو کے استقبال کی تیاریاں ہورہی تھیں اور تیسرے دن سرنگاپٹم میں اس خبر پر خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ حیدرعلی کے ہونہار بیٹے نے اپنی پہلی سیاسی مہم میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور نظام کی افواج چیناپٹنا سے واپس حیدرآباد کا رخ کررہی ہیں۔

مرہٹوں اور نظام کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدرعلی کی افواج آندھی اور طوفان کی طرح انگریزوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ۱۷۶۹ء تک حیدرعلی ملیبار کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کرچکا تھا اور انگریز ہر محاذ سے پسپا ہوکر مدراس میں پناہ لے رہے تھے۔ حیدرعلی فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا مدراس کی طرف بڑھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایوانوں پر زلزلہ طاری ہوچکا تھا۔ انگریز صلح کے طالب ہوئے۔

شیر میسور نے جواب دیا: "صلح کی بات چیت اب مدراس میں ہوگی"۔ مدراس سے پانچ میل دور حیدرعلی نے صلح کی شرائط پیش کیں اور انگریزوں نے سر تسلیم خم کردیا۔ انگریز حیدرعلی کے رحم وکرم پر تھے۔ اگر وہ چاہتا تو مدراس کے قلعے پر قبضہ کرنا اس کے لیے چند گھنٹوں کی بات تھی۔ مورخ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتے کہ صلح نامہ مدراس کے اصلی محرکات کیا تھے۔ یہ اس فاتح کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی تھی جس کے نزدیک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا باعث عار تھا یا حیدرعلی کو پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کا خطرہ تھا! بہرحال جب اس صلح کے عملی نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑے آدمی کی غلطی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس معاہدے کی شرائط کے نبھانے کے متعلق اس وقت بھی نیک نیت نہ تھی جب مدراس کا گورنر اس معاہدے پر دستخط کررہا تھا۔

آٹھ ماہ بعد مرہٹوں نے ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ دریائے تنگبھدرا عبور کرکے میسور

پر حملہ کردیا۔ عہدنامہ مدراس کی رو سے انگریزوں پر حیدرعلی کی مدد فرض تھی لیکن انھوں نے مرہٹوں کے خلاف حیدرعلی کا ساتھ دینے سے انکار کردیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز مرہٹوں کی فتح کی امید پر میسور کی بندربانٹ میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔

حیدرعلی قریباً اڑھائی سال مختلف محاذوں پر مرہٹوں کی ٹڈی دل افواج سے برسرپیکار رہا۔ اس عرصہ میں اس کے سرحدی علاقے تباہ ہوچکے تھے۔ مرہٹے شدید نقصانات اٹھانے کے باوجود تازہ دم افواج میدان میں لارہے تھے۔ جولائی ۱۷۷۲ء میں حیدرعلی نے مرہٹوں کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرلی لیکن انگریز افسروں کی بدعہدی اور مرہٹوں کی جارحیت نے اس پر یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ میسور کی آزادی کے دشمن اسے زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی معظم علی نے اکبر خاں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حیدرعلی کی فوج میں روہیلکھنڈ کے چند نوجوان ملازم تھے اور جنگ کے بعد ان میں سے بعض چھٹی پر جارہے تھے۔ معظم علی نے ایک طویل خط لکھا اور ان میں سے ایک نوجوان کے حوالے کردیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:۔

"عزیز بھائی! تمھارے آخری خط کا جواب شاید ابھی تک میرے ذمے ہے۔ میں پچھلے چند برس بے حد مصروف رہا ہوں۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ میں نے تمھارے متعلق اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے لیکن تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیئے کہ میں تمھیں بھول گیا ہوں۔ گذشتہ دس سال میں زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں تمھاری یاد سے غافل تھا۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ انگریزوں اور اس کے بعد مرہٹوں کے خلاف ہماری جنگ کا ایک دور ختم ہوچکا ہے۔ وہ تاریک بادل جو میسور

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے ہیں لیکن میسور میں
میرے حصے کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی ہمارے
راستے میں کئی اور مراحل باقی ہیں۔ میسور کی آزادی اور بقا اور میسور کے علاوہ
تمام ہندوستان کو انگریزوں کے جارحانہ عزائم سے بچانے کے لیے ہمیں
ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سلطان حیدر علی جیسے بیدار مغز انسان کی قیادت
اور شہزادہ فتح علی ٹیپو جیسے اولوالعزم مجاہد کی رفاقت میں لڑنا میرے نزدیک
ایک بہت بڑی سعادت تھی۔ وہ کمسن لڑکا جسے تم نے کئی برس پہلے ایک
شیر کے بچے سے کھیلتے دیکھا تھا۔ اب میسور کی فوج کا بہترین جرنیل بن چکا
ہے۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کسی نوجوان کی ذہانت اور عزم و استقلال
سے مرعوب نہیں ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے سپاہیانہ جوہر، ان کی علمی قابلیت اور ذہانت
اور ان کی پاک بازی اور تقویٰ ہماری مٹتی ہوئی قوم کی سب سے بڑی پونجی ہے
میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہزادہ ٹیپو کی رفاقت میں میری زندگی کا ہر سانس
عبادت ہے [illegible]

سلطان حیدر علی نے جنگ سے فارغ ہوتے ہی مجھے سرنگاپٹم کی فوجی
تربیت گاہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑا اطمینان اور
کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ سے تربیت حاصل کرنے والے نوجوان کسی دن میسور
کے اس رجل عظیم کی قیادت میں مردانگی کے جوہر دکھائیں گے جن کا
نصب العین نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا
اتحاد ہے [illegible]

قریباً چار سال ہوئے شیر علی نے مجھے لکھا تھا کہ میں حج پر جا رہا
ہوں۔ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آج میں ان

کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ تمہارے بڑے بھتیجے، صدیق علی خان کو میسور کے
سب سے بڑے جنگی جہاز کا کپتان بننے کا شوق ہے اور میں نے اس
کی تربیت کے لیے ابھی سے ایک فرانسیسی اتالیق مقرر کر دیا ہے۔
مسعود اور انور اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم بڑے ہو کر اپنے چچا اکبر خاں
کے پاس جائیں گے اور وہاں شیر مارا کریں گے۔ تمہارے سب سے چھوٹے
بھتیجے کا نام مراد علی ہے اور وہ اگلے مہینے دو سال کا ہو جائے گا۔ فرحت
کی والدہ پچھلے سال وفات پا گئی تھیں۔ صابر اور دلاور خاں ابھی تک
میرے ساتھ ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ اگر کبھی فرصت ملے
تو چند دن کے لیے سرنگاپٹم آجاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے
اور تمہاری بھابی، بلقیس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ بچوں کی یہ حالت ہے کہ
جب ان سے کوئی میسور کی فوج کے کسی جوان کی بہادری کا ذکر کرتا ہے
تو وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم نے ہمارا چچا اکبر خاں نہیں دیکھا۔ خدا
معلوم صابر انھیں تمہارے متعلق کتنی فرضی داستانیں سنا چکا ہے کہ وہ
تمہیں اس دور کا سب سے زیادہ شہ زور اور بہادر آدمی سمجھتے ہیں۔ اگر ممکن
ہو تو ضرور آنے کی کوشش کرو۔ [illegible]
[illegible] تمہارا بھائی معظم علی

تین ماہ بعد معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے جواب موصول ہوا۔
بھائی جان! میرا خیال تھا کہ آپ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ کئی
بار میں نے سرنگاپٹم آنے کا ارادہ کیا مگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے
کی اجازت نہ دی۔ مرہٹوں نے چند برس سے پھر ہماری سرحدوں پر طوفان
برپا کر رکھا ہے۔ ہمارے علاقے پر تین حملے ہو چکے ہیں۔ پچھلے

(c) ketabton.com: The Digital Library

سال انھوں نے ہمارے دوگاؤں جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔ اس کے بعد میں نے پڑوس کے سرداروں کی مدد سے ان کا تعاقب کیا اور سرحد کے قریب تین سو لیٹروں کے ایک گروہ کا صفایا کر ڈالا۔ اس کے بعد ہمارے علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا لیکن روہیلکھنڈ کو ہمیشہ مرہٹوں کی یلغار کا خطرہ رہتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں ہم کافی منظم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم تنہا کسی بیرونی طاقت کے ساتھ ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم دلّی کے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں، پچھلے دنوں حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر اودھ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رُو سے مرہٹوں کے حملہ کی صورت میں اودھ کی افواج ہماری مدد کریں گی لیکن کاش ہم نواب وزیر اودھ پر اعتماد کر سکتے۔ میسور کے متعلق سوچتے ہوئے بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو جیسے رہنما شمالی ہندوستان میں پیدا ہوتے۔

شیر علی حج کے بعد مدینہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی معرفت انھوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ حج پر جانے سے پہلے وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کر چکے تھے۔ مکان فروخت کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ وہ باقی زندگی بڑے آرام سے گزار سکیں۔

پچھلے سال بلقیس کی والدہ حیدر آباد سے عطیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔ چند ماہ بعد ہمیں شیخ فخر الدین کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ وہیں پر وفات پا گئی ہیں۔ بلقیس چند دن کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے مُصر ہے۔ اگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت دی تو ہم دہلی

www.allurdu.com

سے ہو کر آپ کے پاس آئیں گے۔

بھائی جان! میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور نماز کے بعد میری پہلی دعا آپ کے لیے ہوتی ہے۔ میرا بڑا لڑکا داؤد خاں نو سال کی عمر میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی شہباز خاں چوتھے سال میں ہے۔ پچھلے سال ہمیں خدا نے ایک لڑکی عطا کی ہے، بلقیس نے اس کا نام تنویر رکھا ہے۔ بلقیس آپ کو اور بھابی جان کو سلام کہتی ہے۔"

آپ کا بھائی اکبر

○

معظم علی کو سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ کے ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ پونا میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کے انتقال اور اس کی جانشینی کے دعویداروں کے درمیان خلفشار کی اطلاع ملی۔ حیدر علی کے دل پر مرہٹوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور میسور کے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے چڑھائی کر دی۔ شہزادہ ٹیپو آزمودہ کار افسروں اور سپاہیوں کی ایک فوج لے کر تبرا کی طرف بڑھا اور اس نے تین ماہ کے اندر اندر سرا کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرہٹے ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اس نے مدھا گری اور گرم کنڈہ پر یلغار کر دی۔ اس عرصہ میں حیدر علی ہوسکوٹ کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایک دن معظم علی سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ہوسکوٹ کے باہر میسور کی فوج کے کیمپ میں داخل ہوا۔ وہ گھوڑے سے اترتے ہی حیدر علی کے خیمے کی طرف بڑھا محافظ دستے کے سالار نے اسے دیکھ کر سلام کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کا صبح سے انتظار ہو رہا ہے۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔" افسر خیمے کے اندر داخل ہوا اور چند ثانیے بعد اس

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

نے باہر آ کر کہا۔ "تشریف لایئے۔" [illegible]

معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا۔ نواب حیدر علی، شہزادہ ٹیپو اور پنڈارہ فوج[1] کے سپہ سالار غازی خان ایک چٹائی پر بیٹھے ایک نقشہ دیکھ رہے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "معظم علی تم سفر کے لیے تیار ہو کر آئے ہو نا؟"

"جی ہاں میں تیار ہوں۔" [illegible]

"بیٹھ جاؤ۔ چند دن سے میں ایک اہم مہم کے لیے کسی موزوں آدمی کا متلاشی تھا۔ فتح علی کو اصرار ہے کہ اس مہم کے لیے تم سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں نواب وزیر اودھ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ اب مرہٹوں کے مظالم کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہوسکوٹ فتح کر لیں گے۔ اس کے بعد میں دریائے کرشنا تک ان کا تعاقب کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ اس وقت نواب شجاع الملک کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مرہٹوں پر ضرب کاری لگانے کے لیے اس سے بہتر وقت پھر کوئی نہیں ملے گا۔ اگر وہ اودھ سے پیش قدمی کریں اور ادھر سے ہم آگے بڑھیں تو اس ملک کو مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل سکتی ہے۔ دلی کے دربار میں مرہٹوں کے اثر و رسوخ کے باعث اس ملک کے ہر مسلمان حکمران کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شجاع الملک اگر بیوقوف نہیں تو وہ تمہاری باتوں سے ضرور متاثر ہوگا۔ اس کے بعد [illegible]

---

[1] [illegible] بے قاعدہ فوج جو تیز رفتار سواروں پر مشتمل تھی۔ اس فوج کا کام دشمن کی رسد اور کمک کے راستے مسدود کرنا اور اچانک حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ حملے کے وقت یہ فوج ہراول دستوں کا کام دیتی تھی اور دشمن کے غلبہ کی صورت میں اس سے گوریلا چھاپہ مار دستوں کا کام لیا جاتا تھا۔ [illegible]

تم روہیلکھنڈ میں حافظ رحمت خان کے پاس جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اتحاد کے بعد دلی کے بے بس امراء بھی جاگ اٹھیں گے اور نظام بھی یہ محسوس کرے گا کہ غیر جانبداری اس کے لیے سودمند نہیں ہوگی۔ مرہٹوں سے نپٹنے کے بعد ہم چند ہفتوں میں انگریزوں کو سمندر کی طرف دھکیل سکیں گے۔ تم نواب اودھ کو یہ سمجھاؤ کہ اس وقت اودھ اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگ میسور میں لڑی جا رہی ہے۔ سرنگا پٹم میں بھی تمہاری خدمات کی ضرورت تھی لیکن یہ کام زیادہ اہم ہے۔" [illegible]

معظم علی نے کہا۔ "مجھے اس کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔" [illegible]

"نہیں، تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں آج شام تک نواب شجاع الملک اور حافظ رحمت خان کے نام خطوط لکھوا کر تمہارے حوالے کر دوں گا لیکن تمہیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جب تک ہمارے مابین تعاون کا کوئی معاہدہ طے نہیں پا جاتا اس وقت تک ہمارے ارادوں کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ شہزادہ ٹیپو تمہیں لکھنؤ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔"

اگلے دن معظم علی علی الصباح پانچ سواروں کے ہمراہ لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔

[illegible]

نواب وزیر اودھ اپنے محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا آصف الدولہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان یہ وہی معظم علی ہے جو دس بارہ سال قبل یہاں تجارت کرتا تھا اور جس نے پانی پت کی جنگ میں بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس وقت آپ ملاقات نہیں کر سکتے لیکن وہ مصر ہے اور کہتا ہے کہ میں میسور سے حیدر علی کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں اور میری ملاقات کا اودھ کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اسے بلا لاؤں، ممکن ہے کوئی اہم

(c) ketabton.com: The Digital Library

www.allurdu.com

بات ہو۔ سپاہی اسے ملاقات کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے یہ تسلی کر چکے ہیں کہ وہ مسلح نہیں ہے۔"

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔"اگر یہ وہی معظم علی ہے تو ہم اس سے ضرور ملیں گے، اسے بلاؤ!"

آصف الدولہ کمرے سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی کے سلام کے جواب میں شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن معظم علی نے اس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آصف الدولہ نے اپنے باپ کے قریب بیٹھتے ہوئے مسند کے سامنے خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔"تشریف رکھیے۔" لیکن اس نے کہا۔"میں بیٹھ کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے صرف چند منٹ درکار ہیں۔ میں نے لکھنؤ پہنچتے ہی ایک وحشت ناک خبر سنی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیلکھنڈ پر چڑھائی کر دی ہے؟"

شجاع الدولہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔"اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔"

معظم علی نے کہا۔"اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے میں وارن ہیسٹنگز کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اودھ کے مستقبل کے امین ہیں اور ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے اودھ کی رعایا اور اودھ کی حکومت کے ساتھ دلچسپی ہے۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔"تمہیں اودھ کے مستقبل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند دن تک تم یہ سنو گے کہ ہم اودھ کی مملکت میں ایک وسیع علاقہ شامل

کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔"اگر وسیع علاقے سے آپ کی مراد روہیلکھنڈ ہے تو وہ دن دور نہیں جب اودھ کا ہر بچہ بوڑھا آپ کے اس فیصلے کی مذمت کرے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روہیلکھنڈ آپ کی مملکت کا حصہ بننے کی بجائے ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بن جائے گا جن کے ہاتھ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے روہیلکھنڈ کو تباہی سے بچائیے ورنہ شرافت اور انسانیت کے یہ دشمن کسی دن دلی اور اودھ پر چڑھ دوڑیں گے!"

شجاع الدولہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔"تمہیں معلوم ہے کہ حافظ رحمت خاں نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ اگر ہم مرہٹوں کے خلاف اسے مدد دیں گے تو وہ اس کے عوض ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرے گا۔ گذشتہ سال جب مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا تھا تو ہم نے معاہدے کے مطابق رحمت خاں کی اعانت کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرنے کے وعدے سے منحرف ہو گیا ہے!"

معظم علی نے کہا۔"لیکن میں نے سنا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے جنگ کی صورت میں یہ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مرہٹے جنگ کیے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ پھر بھی اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلوں کو یہ رقم ضرور ادا کرنی چاہیے تو اس کے لیے روہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ خدا کے لیے اپنی افواج کو روکیے اور روہیلوں کو انگریزوں کے ساتھ نپٹنے دیجیے۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ میں حافظ رحمت خاں کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ چالیس روپے کے بدلے آپ سے لڑائی مول لینا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر مجھے وہاں سے مایوسی ہوئی تو بھی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے

(c) ketabton.com: The Digital Library

گی۔ میں حیدر علی کے پاس جاؤں گا اور اگر میں نے بارہ سال کی رفاقت کے بعد انھیں غلط نہیں سمجھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ دو مسلمان طاقتوں کا تصادم روکنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا۔ "تم بہت دیر سے آئے ہو۔ ہم چالیس لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کر چکے ہیں۔ ہماری افواج روہیلکھنڈ میں داخل ہو چکی ہیں اور دو تین دنوں کے اندر اندر میراں پور کٹرہ پر ہماری فتح کا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری حافظ رحمت خان پر عائد ہوتی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ مستقبل کے مورخ اس جنگ کی ذمہ داری کس پر عائد کریں گے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ آج انگریز روہیلکھنڈ کو چالیس لاکھ کے عوض آپ کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں تو کل وہ لکھنؤ کی آزادی کوڑیوں کے مول کسی اور کے ہاتھ فروخت کریں گے۔ اگر آپ کو اس ملک کے خلاف انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پلاسی اور بکسر کے واقعات کے بعد دور ہو جانی چاہیے تھی۔ روہیلکھنڈ پر آپ کی فتح نہیں ہوگی بلکہ اس بیرونی سامراج کی فتح ہوگی جو دلی تک اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔"

آصف الدولہ غصے سے کانپ رہا تھا اور نواب شجاع الدولہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کہا۔ "ہمیں ان معاملات میں تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم نواب حیدر علی کی طرف سے کوئی ضروری پیغام لے کر آئے ہو۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اب آپ کو حیدر علی کی طرف سے کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کو یہ سمجھانا حیدر علی کے بس کی بات نہیں کہ اس ملک میں آپ کے

www.allurdu.com

دوست اور دشمن کون ہیں۔ حیدر علی وحشت و بربریت کی جس آگ کو سات سمندر دور رکھنا چاہتے ہیں وہ لکھنؤ کی چار دیواری تک پہنچ چکی ہے۔"

آصف الدولہ نے کہا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا اس قوم کو اس کے اکابر کی کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں کی سزا نہ دے۔ مجھے اجازت دیجیے۔" معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

آصف الدولہ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ابا جان اس کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے گرفتار کر لیا جائے؟"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "نہیں، اسے گرفتار کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حیدر علی نے اسے کس مقصد سے یہاں بھیجا تھا اور لکھنؤ میں اس کے ساتھی اور کون ہیں۔ ہم نے روہیلکھنڈ فوجیں روانہ کرتے وقت انتہائی رازداری سے کام لیا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ شہر کے لوگوں کو کس نے باخبر کیا ہے۔ تم اس نوجوان پر کڑی نگرانی رکھو۔"

معظم علی نے محل سے نکل کر اس سرائے کا رخ کیا جہاں اس کے ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سرائے کے دروازے پر اس کا ایک ساتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کہیے کچھ کامیابی ہوئی؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "ہمیں چند منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" معظم علی کے تیور دیکھ کر اس کے ساتھی کو کوئی اور سوال پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روہیلکھنڈ کا رخ کر رہے تھے۔

ایک گھنٹہ بعد آصف الدولہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان میں نے جو جاسوس اس کے پیچھے روانہ کیا تھا وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر

(c) ketabton.com: The Digital Library

سے نکل گئے ہیں اور ان کا رُخ روہیلکھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کے پیچھے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا جائے!"

شجاع الدولہ نے جواب دیا "نہیں اب روہیلکھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف لکھنؤ میں ان کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ اگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً اسے گرفتار کر لیتا۔ اب اس کا راستہ روکنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں!"

---

www.allurdu.com

سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خاں کے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی ایک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ نظر آتا تھا۔ ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیوں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحہ کے اندر اندر وحشت، بربریت اور مظلومیت کے کئی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھی انتہائی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں!"

معظم علی کے ایک ساتھی نجف خاں نے کہا۔ "آپ کم از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ لے جائیں۔"

"بہت اچھا! تم میرے ساتھ آؤ!"

نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library